THE NATURE OF SIN.

رسالۂ

حقیقتِ گناہ

مولفۂ

پادری ہوپر صاحب سابق پرنسپل ڈونٹی کالج لاہور جس کے اکثر
مطالب ڈاکٹر جے ملر صاحب کی اسی مضمون کی کتاب سے لئے گئے ہیں

پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی

انارکلی لاہور

سنہ ۱۹۰۵ء

قیمت ۲ر P. R. B. S., LAHORE.

Scanned by CamScanner

فہرست مضامین

نمبر شمار	نام مضمون	نمبر صفحہ
	پہلا حصہ گناہ کی ماہیت	
۱	پہلا باب۔ گناہ شریعت کی مخالفت ہے	۱
۲	دوسرا باب۔ گناہ خدا کی نافرمانی ہے	۸
۳	تیسرا باب۔ گناہ خود غرضی ہے۔	۱۰
	دوسرا حصہ گناہ کی تصور واری	
۴	چوتھا باب۔ تصور واری کی ماہیت	۳۹
۵	پانچواں باب۔ خدا کی پروردگاری اور آدمی کی تصور واری	۴۲
	تیسرا حصہ کیا گناہ ضروری ہے؟	
۶	چھٹا باب۔ آدمی کی ناتمامی	۵۱
۷	ساتواں باب۔ آدمی کی حیوانیت	۵۵
۸	آٹھواں باب۔ آدمیت کے متضاد احوال	۶۷
۹	نواں باب۔ دو آسمان۔	۷۵
	چوتھا حصہ گناہ کا امکان	۷۸
۱۰	دسواں باب۔ آزادی اور مجبور مختاری	
۱۱	گیارھواں باب۔ ہم کسی قدر خود مختار ہیں	۸۲
۱۲	بارھواں باب۔ پوری خود مختاری	۸۵
۱۳	تیرھواں باب۔ خدا کی خالقی اور آدمی کی خود مختاری	۸۷
۱۴	چودھواں باب۔ خدا کی قدرت مطلق اور آدمی کی خود مختاری	۹۸

Scanned by CamScanner

نمبر شمار	نام مضمون	نمبر صفحہ
۱۵	پندرھواں باب۔ خدا کا علم مطلق اور آدمی کی خود مختاری	۱۰۲
	پانچواں حصّہ گناہ کی تاثیر	
۱۶	سولھواں باب۔ آدمی کسی قدر گناہ گار ہے	۱۰۶
۱۷	سترھواں باب۔ گناہ آدمی کی طبعی خرابی ہے	۱۱۲
۱۸	اٹھارھواں باب۔ موروثی بُرا میلان	۱۲۱
۱۹	اُنیسواں باب۔ طبعی گناہگاری اور موروثی بُرا میلان	۱۲۵
۲۰	بیسواں باب۔ شخص واحد میں گناہ کی ترقّی	۱۳۰

Scanned by CamScanner

حقیقت گناہ

پہلا حصّہ گناہ کی ماہیت

پہلا باب

گناہ شریعت کی مخالفت ہے

اس دُنیا میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں ایک عیب بھی ہے جس سے غم اور نقصان پیدا ہوتے ہیں اور جس سے اس دُنیا کی بہت سی روشنی پوشیدہ اور تاریک ہو گئی۔ اُسے **بدی** کہتے ہیں۔ اِس پر غور کرنا اگرچہ خوشی کا باعث نہیں ہے مگر پھر بھی ضرور ہے کیونکہ جب تک اُس کی ماہیت نہ جانیں کس طرح اس پر غالب آ سکتے ہیں۔ رنج و مصیبت سے بے فکر رہنا رُوح کی بزرگی و شرافت کا نشان ہے لیکن بدی سے بے فکر رہنا بدی کے اور بڑھنے کا سبب ہے۔ اپنی کم عقلی یا نادانی یا کمزوری کے پہچاننے سے افسوس تو ہوتا ہے لیکن اپنے پر عیب نہیں لگایا جاتا مگر جو اپنی بدی سے واقف ہوتا ہے وہ اپنے تئیں معذور بھی جانتا ہے۔ جتنی خرابیاں اور مصیبتیں ہیں ہم یہ سوچ کر اُن پر رانسی ہو سکتے ہیں کہ اُن سے ہمارا حقیقی اور آخری فائدہ

ہو گا مگر بدی کہ کتنا ہی سوچیں کتنا ہی سیکھیں اُس کی بُرائی کچھ کم نہیں ہو گی +

وہ قوت جس سے ہم اپنے حال اور مآل پر اختیار رکھتے ہیں **خود مختاری** کہلاتی ہے۔ مرضی تو حیوانوں کی بھی ہوتی ہے لیکن خود مختاری صرف اُن ہی کو حاصل ہے جو اپنے تئیں جانتے ہیں اور جو فعل وہ کرنے والے ہیں اُس کو پہلے سے سوچ سکتے ہیں +

خود مختاری کے سوا ہم لوگ ایک شریعت سے بھی واقف ہیں خواہ وہ کسی کتاب میں ہو خواہ صرف دل کے اندر ہو وہ شریعت یہ نہیں کہتی ہے کہ کیا ہوتا ہے بلکہ یہ بتاتی ہے کہ کیا ہونا چاہئے۔ اُس سے ہماری خود مختاری محدود و محکوم تو ہوتی ہے لیکن روکی نہیں جاتی +

یہ شریعت سراسر نیکی پر مبنی ہے اور اسی سبب سے ہم لوگ اُس کے مطیع ہوتے ہیں نہ اِس وجہ سے کہ وہ حکومت کرنیوالی ہے +

انسان کے جتنے اختیاری فعل ہیں سب پر یہ شریعت حکومت کرتی ہے مگر پھر بھی وہ یہ نہیں کہتی کہ کس کس حالت میں کیا کیا کرنا چاہئے اس کے دو سبب ہیں ایک یہ کہ ہر آدمی کا ہر وقت ایک نیا حال ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ تمام انسان کا حال شریعت کی سند سے بہت جدا ہے۔ ہاں فرزادوں کو بھی صرف شریعت کافی نہیں ہے بلکہ اُن کے لئے بھی ہادی ضرور ہے +

یہ شریعت سب کے واسطے ایک ہی ہے اور بدل نہیں جا سکتی۔ اگرچہ شریعتیں بہت سی کہلاتی ہیں لیکن دراصل میں اسی شریعت کی کم و بیش کامل یا ناتمام نقلیں ہیں +

شریعت کے جو حکم ہوتے ہیں اگرچہ وہ بالکل قطعی نہیں ہوتے

ہو گا مگر بدی کہ کتنا ہی سوچیں کتنا ہی سیکھیں اُس کی بُرائی کچھ کم نہیں ہو گی +

وہ قوت جس سے ہم اپنے حال اور مآل پر اختیار رکھتے ہیں **خود مختاری** کہلاتی ہے۔ مرضی تو حیوانوں کی بھی ہوتی ہے لیکن خود مختاری صرف اُن ہی کو حاصل ہے جو اپنے تئیں جانتے ہیں اور جو فعل وہ کرنے والے ہیں اُس کو پہلے سے سوچ سکتے ہیں +

خود مختاری کے سوا ہم لوگ ایک شریعت سے بھی واقف ہیں خواہ وہ کسی کتاب میں ہو خواہ صرف دل کے اندر ہو وہ شریعت یہ نہیں کہتی ہے کہ کیا ہوتا ہے بلکہ یہ بتاتی ہے کہ کیا ہونا چاہئے۔ اُس سے ہماری خود مختاری محدود و محکوم تو ہوتی ہے لیکن روکی نہیں جاتی +

یہ شریعت سراسر نیکی پر مبنی ہے اور اسی سبب سے ہم لوگ اُس کے مطیع ہوتے ہیں نہ اِس وجہ سے کہ وہ حکومت کرنیوالی ہے +

انسان کے جتنے اختیاری فعل ہیں سب پر یہ شریعت حکومت کرتی ہے مگر پھر بھی وہ یہ نہیں کہتی کہ کس کس حالت میں کیا کیا کرنا چاہئے اس کے دو سبب ہیں ایک یہ کہ ہر آدمی کا ہر وقت ایک نیا حال ہوتا ہے اور دوسرا یہ کہ تمام انسان کا حال شریعت کی سند سے بہت جدا ہے۔ ہاں فرزادوں کو بھی صرف شریعت کافی نہیں ہے بلکہ اُن کے لئے بھی ہادی ضرور ہے +

یہ شریعت سب کے واسطے ایک ہی ہے اور بدل نہیں جا سکتی۔ اگرچہ شریعتیں بہت سی کہلاتی ہیں لیکن دراصل میں اسی شریعت کی کم و بیش کامل یا ناتمام نقلیں ہیں +

شریعت کے جو حکم ہوتے ہیں اگرچہ وہ بالکل قطعی نہیں ہوتے

لیکن جب ہم اُنہیں اپنے حال سے مقابلہ کر کے یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اس حال میں ہم کو کیا کرنا چاہئیے تو بہت سے شک پیدا ہو سکتے ہیں اور ان شکوں کو دور کرنا ہماری تمیز ہی کا کام ہے +

شریعت کی واقفیت کسی قدر ہر ایک آدمی میں موجود ہے اگر کسی میں مطلق نہ ہوتی تو اُس کی آدمیت میں شک ہوتا - جو لوگ اپنے نفسوں میں اُس کا حکم نہیں پہچانتے ہیں وہ بھی اَوروں کے کام کی نسبت خصوصاً اُن فعلوں کی نسبت جو اُنہیں پر واقع ہوں اُس کا حکم جانتے ہیں +

ایسی شریعت کی مخالفت بدی ہے (جہاں ایسی شریعت کی جس کا اختیار کُلّی ہے اور جس کی ضرورت میں شک نہیں ہے مخالفت نظر آتی ہے وہاں بدی کا ظہور معلوم ہوتا ہے) اور بدی یہ ہے کہ جو شریعت سب پر فرض ہے اُس کے برخلاف کوئی آدمی اپنی ہی مرضی پر چلنے کی جرأت کرے - ہماری خواہشیں کتنا ہی زور کریں اور شریعت پر چلنا ہم کو کتنا ہی ناگوار معلوم ہو مگر اُس پر چلنا ہی ہماری سعادت ہے اور اُس سے مُنہ موڑنا باعث ندامت بیشک ہزاروں نیک کام ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کے کرتے وقت شریعت کا خیال نہیں ہوتا لیکن اگر وہ شریعت کے مطابق نہیں ہیں تو نیک نہیں ہیں - شریعت ہم سے غیر اور ہماری مرضی اور خیالوں سے جُدا ہے لیکن ہماری خود مختاری کے سبب ہم پر حکومت رکھتی ہے اور جہاں خود مختاری نہیں ہے وہاں وارد نہیں ہو سکتی - چنانچہ حیوانوں اور دیوانوں کو بدی کے ساتھ منسوب نہیں کر سکتے - اور نہ بالحقیقت چھوٹے بچوں سے بھی بدی کے کام ہو سکتے ہیں حالانکہ اُن میں جو خود مختاری اور شریعت کی واقفیت کے بیج موجود ہیں

اِس سے گناہ بھی اُن کے ساتھ ناقص طور پر منسوب ہو سکتے ہیں۔ مقدس کتاب میں گناہ کی یہی تعریف پائی جاتی ہے یوحنا کے پہلے خط کے ۳ باب ۴ "گناہ شریعت کی مخالفت ہے" یونانی میں جو حرفِ تعریف مکرر لایا گیا اُس سے یہ قول فی الحقیقت حدِ یعنی تعریف ٹھیرا +

اس مقام میں تین شک پیش آتے ہیں +

۱۔ کیا سب طرح کا گناہ شریعت کی مخالفت ہے؟ کیا بدی کا کام اور دل کی حالتِ بد دونوں شریعت کے برخلاف ہیں ؟

جواب۔ ہاں۔ کیونکہ نہ صرف کام دل کی حالت سے پیدا ہوتا ہے بلکہ دل کی حالت بھی کام سے پیدا ہوتی ہے اور اگر کام شریعت کے برخلاف ہے تو جو کچھ کام سے پیدا ہوتا ہے وہ بھی اُس کے برخلاف ہوگا۔ مقدس کتاب کی بھی گواہی اِسی طرح کی ہے۔ ہاں رسول شریعت کی نسبت کہتا تو ہے کہ جو اُس کو کرتا ہے سو اُس کے سبب سے جئے گا۔ لیکن ان لفظوں میں کام اور حالت کے فرق کا کچھ ذکر نہیں ہے بلکہ اپنی محنت اور ایمان کے فرق کا ذکر ہے۔ رومیوں کے خط کے ۷ : ۱۴ میں شریعت کو رُوحانی یعنی رُوح القدس کی مرضی اور خیالوں کے موافق لکھا ہے اگر تمام دل کی حالت شریعت کے اختیار میں نہوتی تو کس طرح اُس نے گناہ کی شناخت پیدا ہوتی اور نیز اس صورت میں پابندِ شریعت آدمی کا راستباز نہ ہو سکنا شریعت ہی کی ناتمامی کے سبب سے ہوتا۔ لیکن

لہ اوّل عدد یعنی ۳ سے باب اور دوسرے عدد یعنی ۴ سے آیت مراد ہے۔ آیندہ بھی اس کتاب میں ایسا ہی سمجھنا چاہئے +

ملہ رومیوں کے خط کے ۳ : ۲۰ کو دیکھو +

رومیوں کے خط کے ۸: ۳ میں صاف لکھا ہے کہ شریعت جسم کے سبب سے کمزور تھی۔ رومیوں کے خط کے ۷: ۱۳ اور ۱۴ کو دیکھو۔ مسیح کی نجات کا یہی مطلب ہے کہ شریعت کے لوازم ہم سے پورے ہو سکیں۔ رومیوں کے خط کے ۸: ۱۴ کو دیکھو اور گلاتیوں کے خط کے ۳: ۲۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں جو نقص ہے سو یہ نہیں ہے کہ وہ ہر طرح کی استبازی کا حکم نہیں کرتی بلکہ یہ ہے کہ وہ خود زندگی نہیں بخش سکتی۔ اور جب اُس[1] جوان نے مسیح سے پوچھا کہ کیا چیز ہے جس سے میں ہمیشہ کی زندگی کا وارث ہو سکتا ہوں؟ تو مسیح نے فرمایا کہ احکام کو پورا کر۔ اس مقام پر ایک یہ بھی شک پیدا ہوتا ہے کہ اگر شریعت ہر طرح کی نیکی کو حاوی نہیں ہے تو شاید بعضے نیک کام ایسے بھی پائے جائینگے جو مافوق الفرض یعنی شریعت کے احاطہ سے خارج ہوں۔ رومی کلیسا کی تو یہی رائے ہے اور اُسکے خاص معلم یوں کہتے ہیں کہ مسیحیوں کی محبت شریعت کی پابند نہیں ہے بلکہ ہمیشہ شریعت کے لوازم سے بڑھ کر اور زیادہ کام کرنا چاہئے ہے۔ اس کا ذکر خصوصاً ریاضت کی ذیل میں ہوتا ہے۔ لیکن اگر ریاضت کرنی اُس کے نہ کرنے سے بہتر اور خدا کو زیادہ پسندیدہ ہوتی تو ہم پر فرض ہی ہوتی۔ اور جب کہ شریعت کا خلاصہ یہی ٹھہرا کہ پوری محبت کریں تو کس طرح محبت شریعت سے زیادہ ہو سکتی ہے۔ اس غلطی کا سبب یہ ہے کہ رومی کلیسیا میں دل کی حالت پر لحاظ نہیں کیا جاتا بلکہ صرف افعال پر لحاظ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اُس کے علما کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ آدمی ایک ہی وقت میں گناہ بھی کرے اور زائد الفرض کام بھی" لیکن وہ اس غلطی کے ثبوت کے واسطے متی ۱۹: ۲۱ پیش کرتے ہیں

[1] متی کے ۱۹: ۱۶، ۲۰ اور ۲۱ کو دیکھو۔

اور کہتے ہیں کہ جب اُس جوان نے کہا کہ "میں نے سب احکام پورے کئے" تو مسیح نے اُس کو جھٹلایا نہیں بلکہ شریعت کے علاوہ کمال کی راہ اُسکو بتائی۔ لیکن جب اُس نے وہ راہ اختیار نہ کی تو مسیح کے کہنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ کسی خاص کمال سے بلکہ خدا کی بادشاہت ہی سے محروم رہا۔ مسیح کا یہی مطلب تھا کہ وہ فی الحقیقت شریعت کو پورا نہیں کرتا تھا۔ بلکہ پہلے حکم کے برخلاف اپنے دل میں ایک غیر معبود رکھتا تھا۔ پھر وہ لوگ کرنتھیوں کے پہلے خط کے ۹ : ۱۲-۱۸ اسند پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پولوس اسکو ثواب سمجھتا تھا کہ مزدوری کے واسطے نہیں بلکہ بے اُجرت انجیل سناتا تھا۔ لیکن جب وہ یہ کہتا ہے کہ اگر میں ایسا نہ کرتا تو اپنے اختیار کو بُری طرح استعمال کرتا تو پھر کس طرح ایسا کرنا زائد الفرض ہو سکتا؟ اس رائے کا زیادہ تر ثبوت اُسی مقام سے ہو سکتا ہے جس پر استناد کر کے اکثر پروٹسٹنٹوں نے اُس کی مخالفت کی ہے یعنی لوقا ۱۷ : ۱۰ میں مسیح کا جو یہ قول ہے کہ بندہ تمام احکام کو پورا کر کے اپنے تئیں نکما بندہ جانے کیونکہ ابھی تک اُس نے صرف وہی کیا ہے جو اُس پر فرض تھا۔ اس سے یہ شبہ گذرتا ہے کہ اگر فرض سے کمال مراد ہے تو خود مسیح بھی نکما بندہ تھا اور نہیں تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ کمال مافوق الفرض ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ کمال کا کچھ ذکر نہیں ہے بلکہ صرف ظاہری طور سے شریعت پر عمل کرنے کا مذکور ہے اور مسیح کا یہ مطلب ہے کہ کمال اس طرح عمل کرنے سے مافوق ہے +

۲ - کیا یہ ہی صرف شریعت کی مخالفت ہی ہے۔ یا اُس میں ناتمام رہنا بھی بدی ہے؟

لہ پہلے دوسرے وغیرہ حکم سے اُن دس احکام کی طرف اشارہ ہے جو موسیٰ کو ملے تھے +

جواب۔ نہیں کیونکہ کمال اور بے عیبی میں بڑا فرق ہے اور اسی طرح ناتمامی اور بدی میں بھی ناتمامی مخلوق کا اصلی حال ہے۔ بدی اس کا اصلی حال نہیں ہے۔ کمال منزل کے طور پر اس آگے پیش کیا جاتا ہے کہ وہ اس تک رفتہ رفتہ پہنچے۔ خداوند مسیح ناتمام تھا اور رفتہ رفتہ کامل ہوتا گیا لیکن بے عیب ابتدا ہی سے تھا۔ ناتمامی کمال کی راہ ہے بدی سے کبھی کوئی کمال کو نہیں پہنچتا۔ کیونکہ وہ بالکل دوسرے راستے پر ہے +

شریعت اور فرائض میں فرق ہے۔ شریعت سب کے واسطے برابر ہے اور اس میں حالتوں اور وقتوں کا کچھ لحاظ نہیں۔ فرض وہ ہے جو کسی ایک شخص کو کسی خاص وقت اور خاص حالت میں کرنا چاہیے۔ ہر وقت اور ہر حالت میں ہر ایک آدمی پر کچھ نہ کچھ فرض ہے چاہے کسی کام سے باز رہنا ہی کیوں نہ ہو۔ اسی واسطے اگر ہم شریعت کا ذکر چھوڑ کر پوچھیں کہ کیا فرض کی صرف مخالفت ہی بدی ہے۔ یا اس میں ناتمام رہنا بھی بدی ہے؟ تو اس سوال کا جواب ہاں ہوگا کیونکہ اگر ہر لمحہ کا فرض پورا نہ ہوا تو اس کی مخالفت یعنے گناہ ہوا۔ لیکن اگرچہ ہم ہر وقت کے فرض کو ادا کریں پھر بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہمارا حال بالکل شریعت کے مطابق ہے یعنے ہم کامل ہیں +

۳۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ شریعت کی واقفیت بدی کی واقفیت کا سبب نہ ہو بلکہ شریعت کی واقفیت بدی کی واقفیت کا نتیجہ ہو۔ یعنے جب آدمی اپنے اصلی حال سے بگڑ کر بدی کی طرف مائل ہوا تو کیا اسی وقت شریعت اس کو نہیں معلوم ہونے لگی یہانتک کہ بدی کو شریعت کی مخالفت کرنے والی نہیں بلکہ شریعت کو بدی کی مخالفت کرنیوالی کہنا چاہیے +

جواب۔ نہیں۔ یہ تو سچ ہے کہ شریعت راستباز کے واسطے نہیں ہے جیسا کہ رسول تیمتھیس کے پہلے خط کے ۱: ۹ میں فرماتا ہے یعنے اگر ہم کامل ہوتے تو شریعت سے ہم کو کچھ واسطہ نہ ہوتا۔ لیکن ناتمامی اور بدی ایک ہی نہیں ہے۔ اگر گناہ نہ ہوتا تو بھی جب تک ہم کامل نہ ہوتے شریعت ہدایت واسطے درکار ہوتی۔ اگر گناہ نہ ہوتا تو شریعت کا ہر ایک حکم جس وقت فرض کے طور پر معلوم ہو جاتا اسی وقت عمل میں آکر رفتہ رفتہ ہم کو کمال تک پہنچا دیتا اور یہ معلوم نہ ہوتا کہ شریعت جبراً حکم کرتی ہے۔ مسیح کا یہی حال تھا اور اسی طرح سے وہ اپنے واسطے شریعت کی سندوں کا ذکر کرتا تھا۔ ناتمامی میں گناہ کا امکان تو ہے لیکن کسی چیز کے امکان اور ظہور میں بڑا فرق ہے +

دوسرا باب

گناہ خدا کی نافرمانی ہے

شخصیت[1] میں دو بائیں ہیں خود دانی اور خود مختاری۔ خود دانی میں غیر دانی بھی شامل ہے کیونکہ ہر شے اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ اگر ہم غیر سے واقف نہ ہوتے تو اپنے تئیں اس سے الگ نہ کر سکتے (خود دانی بغیر غیر دانی کے نہیں ہو سکتی اور اسی واسطے غیر دانی سے پیدا ہوتی ہے)

[1] اس کتاب میں ہم نے شخص اس سے مراد رکھی ہے جس میں خود دانی اور خود مختاری ہو۔ اس واسطے خدا اور فرشتے اور انسان لفظ شخص کے ساتھ تعبیر کئے جائینگے حیوان اور ادنیٰ مخلوقات جو انسان سے ادنیٰ ہے وہ شخص میں داخل نہیں۔ آدمی کی شخصیت اسکی روح ہی میں ہے۔ جسم سے غرض نہیں +

لیکن وہ غیر کیا ہے؟ کیا وہ دنیا ہو سکتی ہے؟ نہیں۔ دنیا نادان ہے یعنی اپنے تئیں نہیں پہچانتی اور نادان سے خودداری ہرگز نہیں پیدا ہو سکتی۔ پس یقیناً ہماری خودداری اُس خودداں سے پیدا ہوئی ہے جو دنیا اور سارے شخصوں کا خالق ہے ہماری خودداری کی بنیاد خدا دانی ہے۔ جتنا ہم اپنے میں غور کرتے ہیں اتنا ہی خدا سے قریب ہو جاتے ہیں۔ جب ہم اپنے تئیں خوب سوچتے ہیں اُسوقت دنیا دانی کا پردہ پھاڑ کر اُسکو پاتے ہیں جس سے ہم جیتے اور چلتے پھرتے اور موجود ہیں۔ خدا کو ہم از خود پہچانتے ہیں اور اَور سب چیزوں کو صرف قیاس یا دلیل سے جانتے ہیں +

اسی طرح ہماری خود مختاری میں تمیز یعنے شریعت کی پہچان شامل ہے اور وہ اس سے محدود ہے یہ دو چیزیں یعنی خدا دانی اور شرع دانی آپس میں بڑا علاقہ رکھتی ہیں۔ جب خدا دانی کسی میں پیدا ہوتی ہے اُسی وقت اُس کی تمیز بھی مؤثر ہوتی ہے۔ جو خدا دانی کو صحیح نہیں مانتا وہ شریعت کا بھی ادب نہیں کرتا۔ اگر کہیں ایسے نیک آدمی ملیں جو خدا کو نہ پہچانتے ہوں تو یہ شاذ ہے۔ کسی قوم یا گروہ کا ایسا حال نہیں ہو سکتا +

ان باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شریعت کا بانی اور حاکم خدا ہے۔ پس جو کچھ شریعت کی رو سے ہم پر فرض ہے وہ خدا ہی کی طرف سے ہم پر فرض ہے۔ اور شریعت کی تابعداری خدا کی فرمانبرداری ہے۔ اگر شریعت کا بانی ایسا نہ ہوتا جو سب کا خالق اور مالک ہے تو کس طرح اُس کا اختیار سب لوگوں پر ہوتا۔ کس طرح شریعت سب کے واسطے یکساں ہوتی۔ اور خدا اس واسطے بھی شریعت کا بانی ہونے کے لائق ہے کہ شریعت اُس کی ذات کے واسطے نہیں ہے یعنے اگرچہ اُس کا حال اور اُس کے افعال بالکل شریعت کے مطابق ہیں لیکن شریعت کے محکوم ہونے کے سبب سے

نہیں ہیں بلکہ از خود ہیں۔ وہ بالذات کمال نیک ہونے کے سبب سے شریعت کا محتاج نہیں ہے لیکن اور شخصوں کی جس طرح ہستی کا بانی ہے اُسی طرح شریعت کا بھی بانی ہے۔ انسان تو اپنے اپنے واسطے قاعدہ نکال سکتے ہیں اور جب تک وہ اُن کو اچھا معلوم ہوتا ہے اُس پر چل بھی سکتے ہیں۔ لیکن وہ جو فی الحقیقت شریعت ہے اور جس میں متفرق راہوں کے بدلتے رہنے سے تغیر و تبدل نہیں ہوتا اور ہر چند اُس کو ٹالو مگر وہ اپنا اختیار جتائے بغیر نہیں رہتی وہ آدمیوں کی طرف سے نہیں بلکہ صرف خدا ہی کی طرف سے ہو سکتی ہے +

ان باتوں سے یہ ثابت ہوا کہ بدی نہ صرف شریعت کی مخالفت ہے بلکہ خدا کی نافرمانی بھی ہے اور اسی سبب سے وہ گناہ کہلاتی ہے۔ اگر شریعت خدا کی طرف سے نہ ہوتی تو ہم اُس کی نافرمانی کو بدی تو کہہ سکتے لیکن گناہ نہ کہہ سکتے +

تیسرا باب

گناہ خود غرضی ہے

اوپر ہم گناہ کی یہ تعریف کر چکے ہیں کہ وہ شریعت کی مخالفت اور خدا کی نافرمانی ہے لیکن یہ تعریف دلالت[1] التزامی کے طور پر تھی

[1] جس شے کے لئے کوئی لفظ وضع ہوا ہو اگر وہ اُس شے کے تمام معنی پر دلالت کرے تو اس دلالت کو دلالت مطابقی کہتے ہیں جیسے انسان کی دلالت حیوان ناطق پر اور اگر وہ لفظ ایسے معنوں پر دلالت کرے جو اُس شے کی ذات میں نہیں بلکہ خارجاً اُسکو لازم ہیں تو ایسی دلالت کو دلالت التزامی کہتے ہیں جیسے انسان کی دلالت ضاحک (ہنسنے والا) پر +

اب ہم اس کی تعریف دلالت مطابقی کے طور پر کرتے ہیں جس سے اس کی ذات کما ہو معلوم ہو گی یعنے یہ بتاتے ہیں کہ گناہ کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اس کے واسطے پہلے یہ دریافت کرنا چاہئے کہ نیکی کیا ہے؟ ان دونو کی انواع بے شمار ہیں اور اسی سبب سے ان دونو میں سے ہر ایک کی ایک حقیقت ٹھیرانی بہت مشکل ہے مگر غیر ممکن نہیں ہے ورنہ سب طرح کی نیکی کو کیوں نیکی کہیں اور سب طرح کی بدی کو کیوں بدی کہیں۔ نیکی اور بدی کی حقیقتیں تجربہ بغیر نہیں معلوم ہو سکتیں بلکہ اس کے بعد تامل کرنے سے دریافت ہوتی ہیں اور اگر آدمی کسی طرح ان کو نہیں پہچانتے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے +

یہاں ایک یہ شک پیدا ہوتا ہے کہ کیا خدا کی مرضی اور خلاف مرضی کے سوا نیکی اور بدی کی اور حقیقتیں ٹھیر سکتی ہیں یعنے کیا یہ کافی نہیں ہے کہ جو کچھ خدا چاہتا ہے وہ نیک ہے اور جو کچھ وہ نہیں چاہتا وہ نیک نہیں ہے بلکہ بد ہے۔ یہ رائے یورپ کے بعض معلموں کی ہے۔ بلکہ دے کرت کا یہ مذہب ہے کہ علم ریاضی اور علم منطق کے قواعد بھی خدا کی محض مرضی سے ہیں یعنے اگر خدا چاہتا تو انہیں بدل سکتا +

لیکن خدا کی خود مختاری بے قاعدہ نہیں ہے۔ خدا کے حکم نہ صرف فرمان ہیں بلکہ اس کی ذات و صفات کے ظاہر کرنے والے بھی ہیں۔ ورنہ ہم کبھی نہ جان سکتے کہ خدا کیسا ہے۔ دنیا اور ہمارے دل کی گواہی بالکل بیفائدہ ہوتی۔ صرف اس کی قدرت ہی معلوم ہوتی۔ اور ایسے خیال سے بیدینی کچھ دور نہیں ہے +

ایسی خود مختاری آزادی نہیں بلکہ اتفاقات کی تابعداری ہے

جو کوئی محض اس وجہ سے کچھ کرنا چاہتا ہے کہ اُس فعل کو اُس کا جی چاہتا ہے وہ صرف وہی کرنا چاہتا ہے جو اُسی وقت کی اتفاقی حالت سے اُس کے دل میں آیا ہے۔ لیکن جس کو اس بات کا علم بھی ہے کہ یہ میری خواہش کیوں ہے وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے خود مختاری کے ساتھ چاہتا ہے۔ بیقاعدگی آدمی کے ساتھ تو منسوب ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اُس میں علم اور مرضی دونو جدا جدا ہو سکتی ہیں لیکن خدا کے ساتھ نہیں ہو سکتی کیونکہ اُس کے خیالوں کی سچائی اور حکمت اور راستی کے مطابق ہی اُسکی مرضی بھی ہمیشہ ہوتی ہے ؛

ہاں خدا کو مانے بغیر شریعت کو ماننا محض نادانی ہے مگر پھر بھی شریعت خدا کی محض مرضی سے نہیں ہے بلکہ اُس کے علم ہی میں اُسکی بنیاد ڈالی گئی ہے۔ جب اُس کی یہ مرضی ہوئی کہ جو اُس کے علم میں ہے وہ مخلوقات پر ظاہر کرے تو اُس وقت شریعت کا ظہور ہوا۔ جو لوگ خدا کے بالکل منکر ہیں وہ بھی اُس کی شریعت کو بالکل اپنے دلوں سے نہیں مٹا سکتے۔ اگرچہ آدمی نے خدا کو چھوڑ دیا ہے مگر پھر بھی اُس کی طرف سے ایک ایسا علاقہ رہتا ہے۔ جس سے آدمی پھر اُس کی طرف آ سکے بعضے لوگ تو رومیوں کے ۴: ۱۵ سے یہ بات نکالتے ہیں کہ نیک و بد کا فرق شریعت ہی سے پیدا ہوا نہ کہ شریعت نیک و بد کے ازلی ابدی فرق کے مطابق بنی ہے۔ لیکن یہ بات اُس آیت سے ثابت نہیں ہو سکتی اس میں تو شک نہیں کہ جہاں کچھ شریعت نہیں ہے وہاں اُس سے عدول بھی نہیں ہو سکتا اور نہ خدا اُن پر غضبناک ہو سکتا ہے جن کو اُس نے آگے آگاہ نہیں کیا ہے لیکن اس میں نیک و بد کی اصل کا کچھ ذکر نہیں ہے ؛

رومیوں کے ۷۔ ۷–۱۴ میں۔ جو لکھا ہے اُس سے صاف

ثابت ہوتا ہے کہ باوجود شریعت جو بُرے کام ہوتے ہیں اُنکی بیخ شریعت نہیں ہے کیونکہ یہ پاک اور بے عیب ہے۔ اور رومیوں کے ۸: ۷ سے ثابت ہے کہ بدی شریعت سے نہیں پیدا ہوئی ورنہ پولوس اگرچہ یہ لکھ سکتا کہ "وہ تابعدار نہیں ہے" مگر یہ نہ لکھ سکتا کہ "وہ تابعدار ہو سکتا بھی نہیں" ÷

اگر نیکی کی حقیقت ہم سے دریافت نہ ہو سکتی تو شریعت ہمارے لئے ظاہری حروف ہی رہتی اور ہمیں اُس کے مختلف احکام کو جداگانہ ماننا ضرور ہوتا۔ لیکن چونکہ مسیحی لوگ شریعت کے جوئے سے سبکدوش ہیں اور رُوح القدس اُن سے شریعت کے اعمال کراتا ہے تو یقین ہے کہ ہم شریعت کا وہ خلاصہ سمجھ بھی سکتے ہیں جس سے اُس کے مختلف احکام کا اتحاد معلوم ہو جائے ÷

نیکی کیا چیز ہے؟ اس سوال کا جواب اس بات کے دریافت کرنے سے معلوم ہوگا کہ کس سبب سے اُسے کرنا ضرور ہے۔ جو کچھ شریعت پر عمل کرنے کا سبب ہونے کے لائق ہے وہی شریعت کا خلاصہ بھی ہوگا۔ شریعت پر اُس کی خوبی کے سبب اور جہنم کے ڈر اور بہشت کی اُمید اور اَور سببوں سے عمل کیا جاتا ہے۔ لیکن اُن میں سے کوئی ایسا لائق سبب نہیں معلوم ہوتا جس سے ہر وقت اور ہر حالت میں اُس پر عمل کیا جائے۔ جب یہ بات ہے تو پھر وہ کون سا لائق سبب ہے؟ وہ لائق سبب خدا کی محبت کے سوا اَور کوئی نہیں ہے ÷

جب مسیح سے پوچھا گیا کہ شریعت کا سب سے بڑا حکم کون سا ہے تو اُس نے فرمایا کہ "محبت کرنی خدا سے اور اپنے پڑوسی سے

لہ رومیوں کے ۸: ۷ کو دیکھو ÷

محبت رکھو" اور اس لئے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ حکم اور حکموں سے صرف بڑا ہے مسیح نے یہ بھی فرمایا کہ "ان ہی دو احکام پر ساری شرع اور سب نبیوں کی باتیں موقوف ہیں" یہاں اگرچہ مسیح نے دو حکم فرمائے لیکن پھر جب خدا کی محبت کے حکم کی نسبت یہ کہا کہ "پہلا اور بڑا حکم یہی ہے" تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسی ایک پہلے حکم میں دونوں کی اصل پائی جائے گی +

پس خدا نہ صرف سب سے زیادہ بلکہ صرف وہی اکیلا ہمارے محبت کرنے کے لائق ہے - جو محبت اس کی محبت میں محو ہے وہی محبت قائم اور حقیقی ہے - صرف اسی طرح ہم اپنے سارے دل سے خدا سے محبت رکھ سکتے ہیں - ایسی محبت کے ساتھ اور کوئی محبت شریک نہیں ہو سکتی بلکہ اس میں محو ہو گی +

یہ بات کہ نیکی کی اصل خدا کی محبت ہے بائبل کی اور آیتوں سے بھی ثابت ہے مسیح نے یوحنا ۱۴: ۳۱ - اور ۱۵: ۱۰ میں خدا کی محبت کو اپنی نیکی کی اصل کہا اور یوحنا ۱۴: ۱۵ و ۲۱ و ۲۲ و ۲۴ - اور ۱۵: ۱۰ میں اپنے شاگردوں کو سکھایا کہ میری محبت ہی سے تم میرے حکموں پر چل سکو گے +

اسی طرح متی ۱۹: ۱۷ میں جب اس جوان نے نیکی کو کوئی ظاہری چیز اور خدا سے علیحدہ سمجھ کر پوچھا کہ کون سا نیک کام کر کے میں ہمیشہ کی زندگی پاؤں تو مسیح نے (صحیح نسخوں کے موافق) اسے جواب دیا کہ "تو مجھ سے نیکی کے باب میں کیا پوچھتا ہے نیک تو ایک ہی ہے" اور وہ چیز کام نہیں بلکہ شخص یعنے خدا ہے - اس سے مسیح کا یہ مطلب تھا کہ تو اسی نیک شخص سے ملیگا تو ہمیشہ کی زندگی پائیگا - لیکن خدا کی محبت کس طرح ظاہر ہو گی؟ اس کے حکموں کے ماننے سے -

اور جب اُس جوان نے کہا کہ ان سب کو میں مان چکا ہوں تو مسیح نے اُسے ایک ایسا حکم بتایا جس سے معلوم ہو کہ آیا وہ جوان خدا کے فی الحقیقت ایسی محبت رکھتا تھا یا نہیں جس کے بغیر اور کوئی حکم درستی سے ماننا نہیں جاتا +

آدمیوں میں محبت اوّل اوّل انصاف کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ جب بچہ رفتہ رفتہ یہ پہچانتا ہے کہ اور لوگوں کے بھی حق ہیں اور اُن کے واسطے اپنی خواہشوں کو روکنا ضرور ہے اور جب بالغ اپنے ملک کے قانونوں یا اپنے بادشاہ کے فرمانوں کی تعمیل کئے جانے کے لئے سرگرم ہوتا ہے اُس وقت فی الحقیقت محبت کے سایہ اور عکس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ لیکن جب آدمی خدا کو اپنا مقصود جانتا ہے اور سب چیزوں کو اُس کے تحت میں دیکھتا ہے اُس وقت محبت اپنی ذات اور اصلی صورت دکھا دیتی ہے۔ جو خدا سے محبت رکھتا ہے اُس میں نہ صرف جوش اور سرگرمی پیدا ہوتی ہے جو پھر ٹھنڈی ہو سکتی ہے بلکہ اُس کو وہ قطب نما مل گیا ہے جس سے وہ اس دنیا کے اندھیرے سمندر سے بے خطر پار ہو سکتا ہے +

جو کچھ خدا کا ہم پر فرض ہے ادب۔ فروتنی۔ فرمانبرداری توکل اُمید وغیرہ سب اُس کی محبت ہی سے پیدا ہوا ہے بلکہ یہ سب محبت کی مختلف صورتیں ہیں۔ ایمان بھی جو اکثر ساری دینداری کی جڑ معلوم ہوتی ہے محبت پر موقوف ہے۔ محبت کوئی دوسری چیز نہیں جو ایمان سے بڑھ جائے بلکہ جو چیز بغیر محبت کے ایمان معلوم ہوتی ہے وہ ایمان نہیں ہے۔ پس اور نیکیاں جس قدر خدا کی محبت سے پیدا ہوئی ہیں اُسی قدر نیک ہیں کیونکہ اور نیکیاں خاص وقت یا خاص حالتوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ لیکن محبت کسی وقت یا حالت کے

ساتھ خصوصیت نہیں رکھتی کیونکہ خدا کی محبت نہ صرف اُس کی نعمتوں کی احسانمندی ہے بلکہ اُس کی ذات ہی سے اُس کے کمال کے سبب محبت رکھنی ہے +

اگرچہ خدا کی محبت ہماری مرضی پر موقوف ہے پھر بھی ایک دفعہ چاہنے سے نہیں ہو سکتی۔ خدا کی طرف سے اُس کی محبت کا سبب اُس کا فضل ہے اور آدمی کی طرف سے اُس فضل کو قبول کرنا۔

محبت صرف شخص ہی سے ہو سکتی ہے کیونکہ اُسی میں اپنی بہبودی پیدا کرنے کی قابلیت ہے۔ اور محبت کے یہ معنے ہیں کہ کوئی شخص اپنی بہبودی پیدا کر سکتا ہو اور پھر نہ کرے بلکہ اپنے محبوب کی بہبودی اور خیر خواہی میں اس قدر محو ہو جائے کہ اپنی بہبودی کی پروا نہ کرے۔ جو ہم اور تم کا فرق جانتے ہیں وہی محبت کر سکتے ہیں +

جب آدمیوں میں غایت درجہ محبت ہوتی ہے تو کبھی کبھی اُسکے ساتھ کامل اتحاد کی خواہش پیدا ہوتی ہے یعنے وہ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے تئیں اپنے محبوب میں فنا کر دیں۔ لیکن ایسی محبت اندھی ہے اور اپنی غرض کو نہیں پہچانتی۔ اگر اُس کی خواہش کے موافق ہوتا تو محبت ہی معدوم ہو جاتی۔ محبت کی غرض فی الحقیقت یہ ہے کہ محبوب کی مقاربت میں کوئی مانع نہ ہو۔ بلکہ محب اپنے محبوب پر اپنے تئیں بخوبی ظاہر کر سکے اور اسی طرح اُس کو بھی بخوبی پہچان سکے +

بیان مذکور کے مطابق اُن لوگوں نے جو یورپ میں مُسٹک اور ایشیا میں[1] صوفی کہلاتے ہیں ہر زمانہ میں یہ سمجھا کہ خدا کی محبت اُسی وقت کامل ہوتی ہے جب آدمی اس طرح خدا میں مل جائے جسطرح سمندر میں قطرہ

[1] جس کو عام لوگ ایشیا کہتے ہیں +

خواہ زندگی میں وجد کے سبب (جس کو یورپ میں اکسٹاسی کہتے ہیں)
صرف اپنی دانست میں خواہ موت کے بعد فی الحقیقت یہ غلطی ایک بہت
عمدہ خیال سے پیدا ہوئی ہے۔ لیکن جب اس خیال کی کشتی محبت کے
بڑے سمندر کا سفر کر کے ساحل مقصود کے نزدیک پہنچی اُسی وقت تیرے ہم
کی چٹانوں سے ٹوٹ گئی۔ اگر خدا میں ملنا ہی انسان کا کمال ہے تو یہ کمال
انسان کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے حاصل کرنے کے واسطے
انسانیت کو چھوڑنا ضرور ہے۔ ہر ایک شخص کی روح ایسی ہے کہ جس کی
تقسیم نہیں ہو سکتی اور اس سبب سے وہ دوسرے میں نہیں مل سکتا۔
اگر محبت کا کمال اُس کی فنا پر موقوف ہوتا تو محبت بے معنی ہوتی۔
برعکس اس کے جو خدا کی محبت سے اپنے تئیں اُسے سونپ دیتا ہے
وہ اپنے تئیں کھوتا نہیں بلکہ اُسی وقت اپنے تئیں پاتا ہے یعنے اُسی
وقت اُس کی شخصیت اپنا پھل دیتی اور بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔ خدا کی
محبت سے غرض یہی ہے کہ ہم بے مزاحمت اُس کے ساتھ مقاربت
رکھیں اور مقدس کتاب میں جو سب سے عمدہ انعام موعود ہے
وہ یہی ہے۔ بعض کی یہ رائے ہے کہ کرنتھیوں کے پہلے خط کے ۱۵: ۲۸
سے جس میں لکھا ہے کہ "تاکہ خدا سب میں سب کچھ ہو" یہ ثابت ہے
کہ آخر سب کچھ خدا میں مل جائیگا۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو کس طرح خدا سب
میں سب کچھ ہو سکتا کیونکہ اُس کے سوا اور کوئی نہ رہتا۔
اگر صوفیوں کی رائے درست ہوتی تو خدا کی محبت ہر قسم کی نیکی کی جڑ

۱؎ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ خدا ہی سب کچھ ہے اور دنیا صرف اُس کی صورت ہے
اور خالق اور مخلوق میں کوئی حقیقی فرق نہیں اُن کو یورپ میں پنتھےاسٹ کہتے
ہیں اور اُن کی رائے کو پنتھےاسم یا ہمہ اوست ایک قسم کا پنتھےاسم ہے۔

ساتھ خصوصیت نہیں رکھتی کیونکہ خدا کی محبت نہ صرف اُس کی نعمتوں کی احسانمندی ہے بلکہ اُس کی ذات ہی سے اُس کے کمال کے سبب محبت رکھنی ہے +

اگرچہ خدا کی محبت ہماری مرضی پر موقوف ہے پھر بھی ایک دفعہ چاہنے سے نہیں ہو سکتی۔ خدا کی طرف سے اُس کی محبت کا سبب اُس کا فضل ہے اور آدمی کی طرف سے اُس فضل کو قبول کرنا۔

محبت صرف شخص ہی سے ہو سکتی ہے کیونکہ اُسی میں اپنی بہبودی پیدا کرنے کی قابلیت ہے۔ اور محبت کے یہ معنے ہیں کہ کوئی شخص اپنی بہبودی پیدا کر سکتا ہو اور پھر نہ کرے بلکہ اپنے محبوب کی بہبودی اور خیر خواہی میں اس قدر محو ہو جائے کہ اپنی بہبودی کی پروانہ کرے۔ جو ہم اور تم کا فرق جانتے ہیں وہی محبت کر سکتے ہیں +

جب آدمیوں میں غایت درجہ محبت ہوتی ہے تو کبھی کبھی اُسکے ساتھ کامل اتحاد کی خواہش پیدا ہوتی ہے یعنے وہ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے تئیں اپنے محبوب میں فنا کر دیں۔ لیکن ایسی محبت اندھی ہے اور اپنی غرض کو نہیں پہچانتی۔ اگر اُس کی خواہش کے موافق ہوتا تو محبت ہی معدوم ہو جاتی۔ محبت کی غرض فی الحقیقت یہ ہے کہ محبوب کی مقاربت میں کوئی مانع نہ ہو۔ بلکہ محب اپنے محبوب پر اپنے تئیں بخوبی ظاہر کر سکے اور اسی طرح اُس کو بھی بخوبی پہچان سکے +

بیان مذکور کے مطابق اُن لوگوں نے جو یورپ میں مُسٹک اور ایشیا میں[۱] صوفی کہلاتے ہیں ہر زمانہ میں یہ سمجھا کہ خدا کی محبت اُسی وقت کامل ہوتی ہے جب آدمی اس طرح خدا میں مل جائے جسطرح سمندر میں قطرہ

[۱] جس کو عام لوگ ایشیا کہتے ہیں +

خواہ زندگی ہو۔ وجد کے سبب (جس کو یورپ میں اکسٹاسی کہتے ہیں) صرف اپنی دانست میں خود موت کے بعد فی الحقیقت یہ غلطی ایک بہت عمدہ خیال سے پیدا ہوئی ہے۔ لیکن جب اس خیال کی کشتی محبت کے بڑے سمندر کا سفر کر کے ساحل مقصود کے نزدیک پہنچی اُسی وقت وہم کی چٹانوں سے ٹوٹ گئی۔ اگر خدا میں ملنا ہی انسان کا کمال ہے تو یہ کمال انسان کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے حاصل کرنے کے واسطے انسانیت کو چھوڑنا ضرور ہے۔ ہر ایک شخص کی رُوح ایسی ہے کہ جس کی تقسیم نہیں ہو سکتی اور اس سبب سے وہ دوسرے میں نہیں مل سکتا۔ اگر محبت کا کمال اُس کی فنا پر موقوف ہوتا تو محبت بے معنی ہوتی۔ برعکس اس کے جو خدا کی محبت سے اپنے تئیں اُسے سونپ دیتا ہے وہ اپنے تئیں کھوتا نہیں بلکہ اُسی وقت اپنے تئیں پاتا ہے یعنے اُسی وقت اُس کی شخصیت اپنا پھل دیتی اور بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔ خدا کی محبت سے غرض یہی ہے کہ ہم بے مزاحمت اُس کے ساتھ مقاربت رکھیں اور مقدس کتاب میں جو سب سے عمدہ انعام موعود ہے وہ یہی ہے۔ بعض کی یہ رائے ہے کہ کرنتھیوں کے پہلے خط کے ۱۵: ۲۸ سے جس میں لکھا ہے کہ "تاکہ خدا سب میں سب کچھ ہو" یہ ثابت ہے کہ آخر سب کچھ خدا میں مل جائیگا۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو کس طرح خدا سب میں سب کچھ ہو سکتا کیونکہ اُس کے سوا اور کوئی نہ رہتا۔

اگر صوفیوں کی رائے درست ہوتی تو خدا کی محبت ہر قسم کی نیکی کی جڑ

۱؎ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ خدا ہی سب کچھ ہے اور دنیا صرف اُس کی صورت ہے اور خالق اور مخلوق میں کوئی حقیقی فرق نہیں اُن کو یورپ میں پنتھے اسٹ کہتے ہیں اور اُن کی رائے کو پنتھے اسم ویدانت ایک قسم کا پنتھے اسم ہے۔

نہ ہو سکتی یعنی اُس سے کوئی بے شمار شاخوں والا درخت پیدا نہ ہوتا کیونکہ اُنکی رائے کے مطابق خدا کی محبت ہی ایک نیکی ہے اور اس دُنیا سے کچھ بھی علاقہ رکھنا اُس کے برخلاف ہے لیکن جب کہ خدا نے اور چیزیں پیدا کیں اور اپنے علاقہ میں رکھیں تو جو آدمی اپنے تئیں خدا کو سونپ کر اپنے پر اُس کا حق مانتا ہے اُس پر اُن چیزوں کا بھی حق ہوگا +

مخلوقات کے ساتھ جو کچھ کرنا ہم کو لازم ہے وہ خدا کے تین کاموں پر موقوف ہے +

۱- خلقت - خدا نے اپنے سے علیحدہ طرح طرح کی چیزیں پیدا کیں اور وہ اُنہیں اپنے علاقہ میں رکھ کر اپنے تئیں اُن سے ظاہر کرتا اور اُن سے خوش رہتا ہے - اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مخلوقات کا خدا کی محبت کے سبب سے ہم پر حق ہوتا ہے +

۲- اشخاص کو اپنی صورت پر پیدا کرنا - اس سبب سے ہم پر آدمیوں کا حق باقی تمام مخلوقات کے حق سے نہایت زیادہ ہے اسی واسطے خدا کی محبت کے بڑے حکم کے ساتھ مسیح نے دوسرا حکم بھی دیا کہ "اپنے پڑوسی کو اپنے برابر دوست رکھو" ہمجنسی کے سبب اس حکم کا ماننا تو آسان ہوتا ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کی فرضیت اُس سے ہو لیکن جب ہم یہ جانتے ہیں کہ آدمی میں خدا کی صورت ہے تو یہ بھی بہت صاف ہے کہ جو خدا سے محبت رکھتا ہے وہ اُس کے سب ہم صورتوں سے بھی محبت کریگا - پیدائش کے ۹: ۶ میں آدمی کے قتل اور یعقوب کے ۳: ۹ سے ۱۱ تک آدمی کے لعن طعن کرنے کی بدی اسی پر موقوف کی گئی ہے کہ آدمی خدا کی صورت پر پیدا ہوا ہے +

۳- کلام اللہ کا مجسم ہونا اور اس کے سبب گنہگار آدمیوں کا نجات پانا اور پھر اُسی سے زمین پر خدا کی بادشاہت قائم ہوئی جو لوگ ان

باتوں کو مانتے ہیں اُنہیں اور آدمیوں کی نسبت سب طرح کی نیکی کرنی نہایت آسان ہے اور پھر اُن پر آپس میں ایک دوسرے کا حق ایسا ہوتا ہے کہ اور باقی مخلوقات کا نہیں +

پس جب کہ یہ بات قرار پا گئی کہ نیکی کی جڑ خدا کی محبت ہے تو یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اس محبت کا نہ ہونا یعنے خدا سے دل کو پھیرے رکھنا سب طرح گناہ کی جڑ ہے +

رومیوں کے خط کے پہلے باب سے ثابت ہے کہ جب آدمیوں نے خدا کو چھوڑ کر مخلوقات کی پرستش کرنی شروع کی اُسی وقت اور اُسی سبب سے وہ مخلوقات کے غلام ہو کر طرح طرح کی خراب شہوتوں میں پھنس گئے یہاں تک کہ اپنی عقل اور خود مختاری کو جن کے سبب وہ حیوان سے ممتاز ہیں ایسے ذلیل کاموں میں خرچ کیا کہ حیوانوں سے بدرجہا بدتر ہو گئے۔ لیکن پولوس کے کہنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری خرابیاں صرف اسی سبب سے نکلیں کہ آدمی خدا سے پھر گیا اور خدا کے لائق اُس کی بزرگی نہ کی اور نہ اُس کی شکر گذاری کی اور خدا کی سچائی کو جھوٹھ سے بدل ڈالا اور صانع کی نسبت مصنوع کی زیادہ پرستش اور بندگی کی۔ اس مقام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آدمی پہلے خدا سے محبت رکھتا تھا کہ جس طرح خدا نے آدمی ہی کو پیدا کر کے آرام پایا۔ اُسی طرح آدمی بھی خدا ہی کو پا کر آرام سے رہ سکتا ہے۔ جب خدا کی خواہش کسی ایک شخص کے دل سے جاتی رہتی ہے تو اوروں کی دینداری کے سبب ممکن ہے کہ وہ بہت سی طرح کی بدی سے بچا رہے لیکن جب کسی قوم سے جاتی رہتی ہے تو وہ گناہ کے روے ضرور ڈوب جائیگی۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ خدا کی واقفیت کچی اور پکی بھی ہوتی ہے اسی سبب سے جب انجیل کسی

کو سنائی اور سمجھائی جاتی ہے اور وہ قبول نہیں کرتا تو اُس وقت گناہ اپنی حقیقت بالکل ظاہر کرتا ہے کیونکہ اُس حال میں خدا کی سب سے زیادہ صاف محبت دیدہ و دانستہ روک جاتی ہے۔ اسی سبب سے مسیح یا اُس کے کلام کے دُنیا میں کسی جگہ آنے سے اس جگہ عدالت ہوتی ہے یعنے وہاں کے لوگوں کی اندرونی حالت ظاہر ہوتی ہے۔ دیکھو یوحنا کے ۹-۳۹: اور متی کے ۲۱: ۴۲ اور ۴۴-۴۴۔ اور پطرس کے پہلے خط کے ۲: ۶ سے ۸ تک +

لیکن محبت بالکل معدوم نہیں ہے بلکہ ضرور ہے کہ آدمی کسی نہ کسی سے محبت رکھے۔ اگر وہ اُس سے محبت نہیں رکھتا جو محبت کے لائق ہے تو خواہ مخواہ اُس سے رکھیگا جو محبت کے لائق نہیں ہے۔ جب خدا اُس کا معبود نہ ٹھیرا تو کوئی بُت اُس کا معبود ہوگا۔ یہ بُت کیا ہے؟ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ دُنیا ہے۔ لیکن دُنیا سے کیا مراد ہے؟ دُنیا کے شخص یا بیجان چیزیں۔ جو شخص نہیں ہے اُس سے تو فی الحقیقت محبت نہیں ہو سکتی بلکہ آدمی صرف اس لئے اُس کا طالب ہوتا ہے کہ اُسے اپنی خوشی وغیرہ کا وسیلہ سمجھتا ہے۔ پھر ممکن نہیں ہے کہ جو شخص اِس سے جو کمال محبت کرنے کے لائق ہے اپنا دل روک رکھے و دآدمیوں سے محبت کرے۔ صاف ظاہر ہے کہ آدمی کا بُت خود آدمی ہی ہے کیونکہ وہ اپنے ہی واسطے دُنیا کی چیزوں کو چاہتا ہے اور اپنے ہی واسطے وہ آدمیوں کی صحبت اور کسی قدر اُن کا فائدہ بھی چاہتا ہے پس گناہ کی اصل اور حقیقت **خود غرضی** ہے۔ ظاہرا معلوم ہوتا ہے کہ اکثر کام نہ تو خدا کی محبت سے کئے جاتے ہیں نہ خود غرضی سے۔ یہ سچ ہے کہ دونو مطلب اکثر صدور فعل کے وقت

فاعل پر ظاہر نہیں ہوتے لیکن جب کسی سبب سے اپنے دل کو آزمانا ہوتا ہے تو اُس وقت وہ یہ جان لیتا ہے کہ ان دونوں میں سے ایک نہ ایک ہر ایک کام کی اصل ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گناہ نہ صرف بے انتظامی ہے بلکہ بد انتظامی بھی ہے۔ نہ ظاہری طریق کا غبار ہے جس کو جھاڑ ڈال سکیں بلکہ ایک حقیقی بگاڑ ہے جو ہمارے دل کے اندر پھیل گیا ہے۔ گناہ کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اپنے تئیں خدا سے علیٰحدہ دیکھتا ہے اور اپنے تئیں اپنا مقصود بناتا ہے۔ ایسے آدمی بھی ہیں جو ایسے گناہ بہت ہی کم کرتے ہیں جن کے سبب اُن کا دل اُن پر الزام لگائے لیکن وہ نہ خدا کے واسطے زندگی گذارتے ہیں اور نہ اور آدمیوں کے واسطے۔ جب اُن میں سے کوئی خدا کی طرف رجوع کرتا ہے اور خدا کی محبت اُس کے دل میں پیدا ہوتی ہے اُس وقت اپنا تمام بھلا حال جو ظاہر میں بے عیب تھا گناہ آلودہ اور مکروہ دیکھتا ہے کیونکہ گناہ اگرچہ اندر ہی مخفی ہوتا ہے اور دُنیا کو عبرت نہیں بخشتا پھر بھی اپنی ساری قدرت سے دل پر حکومت کرتا ہے +

اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اپنا فائدہ اور بہتری چاہنی گناہ ہے بلکہ خدا نے ایسا قاعدہ باندھا ہے کہ شریعت ہی پر چلنے سے آرام اور خوشی ملتی ہے۔ لیکن جب کسی نے اپنے آرام اور خوشی کو اپنا خاص مطلب اور مقصد بنایا تو نہ وہ حاصل ہوئی اور نہ نیکی +

خود خواہی دو طرح کی ہے۔ ایک تو سب جانداروں کی ہے جس سے وہ اپنی زندگی اور خوشحالی کی حفاظت کرتے ہیں۔ دوسری صرف آدمیوں کی ہے جو یہ پہچان سکتے ہیں کہ خود ہمارا بھی حق ہم پر ہے اور کسی قدر اپنی بہتری میں کوشش کرنی نہ صرف جائز ہے بلکہ ہم پر فرض بھی ہے۔ یہ

لہ یعنے اپنے تئیں چاہنا اور پیار کرنا +

دونو طرح کی خود خواہی گناہ نہیں ہے۔ مقدّس کتاب کے اس بیان سے کہ تو اپنے پڑوسی کو اپنے برابر پیار کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ اپنے تئیں بھی پیار کرنا چاہئے ورنہ یہ حکم ہوتا کہ تو اپنے تئیں نہیں بلکہ صرف اپنے پڑوسی کو پیار کر +

اس سے یہ شک پیدا ہوتا ہے کہ جب خود خواہی صفت نیک ٹھیری تو خود غرضی کس طرح گناہ کی حقیقت ہو سکتی ہے؟ پس کیا نیکی اور بدی کا فرق صرف درجوں ہی کا فرق ہے؟ شاید اس کا جواب یہ ہو کہ ہم کو اپنی بہتری اسی غرض سے چاہنی چاہئے کہ ہم سے اوروں کا زیادہ فائدہ ہو۔ لیکن اگر اس وجہ سے کہ ہم قیدی ہوں یا اور کسی سبب سے آدمیوں کے دل میں کچھ اثر نہ کر سکتے ہوں تو بھی ہم کو اپنے نفس کا حق ادا کرنا ضرور ہے۔ مگر صحیح جواب یہ ہے کہ جس طرح پہلے خدا سے محبت رکھنی چاہئے اور پھر اُس کے سبب اور آدمیوں سے اُسی طرح خدا کی اُسی محبت کے سبب اپنی ذات کو بھی جو خدا کی صورت پر ہے چاہنا چاہئے۔ جو کوئی اپنے تئیں بگاڑتا ہے وہ خدا کی صورت کو بگاڑتا ہے جو اپنی بے عزتی کرتا ہے وہ خدا کی صورت کی تحقیر کرتا ہے۔ اور جو اپنے تئیں خدا کے ہاتھ میں دیدیتا ہے وہ خدا کے ہاتھ سے اپنے تئیں پھر پاتا ہے یعنے وہ حقیقی خود مختاری اور آزادی حاصل کرتا ہے اور اس طرح اپنی حقیقی بہتری کے لئے کوشش کرتا ہے۔ جو خود خواہی اس طرح کی نہیں ہے وہ خود غرضی یعنی عین گناہ ہے +

یہ بات کہ خود غرضی گناہ کی اصل ہے مقدّس کتاب سے خوب ثابت ہے۔ جب گناہ کا پہلا خیال آدمی کو پیش[1] آیا تو اُس نے خدا سے

[1] پیدائش کے ۳: ۵ کو دیکھو۔

آزادی بلکہ اُس کی برابری کا ارادہ کیا۔ پھر گمراہ[۱] بیٹے کی تمثیل کہ اُس کی خرابی اسی سے شروع ہوئی کہ اُس نے اپنے باپ سے الگ اپنے لئے مال چاہا اور پھر اُس کو پاکر اپنے باپ کے گھر سے بالکل جدا ہو گیا۔ اور جب پولوس نے غایت درجہ کے گناہ یعنے دجّال کا حال بیان کیا تو کہا کہ وہ[۲] مردِ گناہ خدا کی ہیکل میں خدا بن بیٹھیگا اور اپنے تئیں دکھائیگا کہ میں خدا ہوں" اور یہ صاف ظاہر ہے کہ دینداری کے واسطے جس چیز کا ترک کرنا ضرور ہے وہ گناہ کی حقیقت ہے۔ لیکن جب مسیح اپنی کامل نیکی ظاہر کرنا چاہتا تھا تو یوں فرماتا تھا کہ میں[۳] اپنی مرضی نہیں بلکہ باپ کی مرضی چاہتا ہوں" اور میں اپنی بزرگی نہیں بلکہ باپ کی بزرگی ڈھونڈھتا ہوں" اسی طرح پولوس[۴] مسیح کے حق میں کہتا ہے کہ وہ اپنی خوشی نہیں چاہتا تھا" اور اسی طرح ہم لوگوں کی نئی پیدائش کا بھی یہ بیان ہے کہ ہم خود غرضی چھوڑکر صرف خدا کے واسطے زندگی بسر کریں (لوقا ۱۴: ۲۶+ یوحنا ۱۲: ۲۵+ کرنتھیوں کے دوسرے خط کے ۵: ۱۵ کو دیکھو) اور مسیحیوں کا چال چلن یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہم اپنی زندگی خود غرضی میں نہیں بلکہ خدا کی مرضی اور آدمیوں کی بہبودی میں صرف کریں (رومیوں کے خط کے ۱۴: ۷ و ۸۔ اور کرنتھیوں کے پہلے خط کے ۱۰: ۲۴ و ۳۳+ فلپیوں کے خط کے ۲: ۴ و ۲۱ کو دیکھو+

اوگستین سے لیکر بہت سے مسیح معلّم غرور کو گناہ کی اصل کہتے آئے ہیں۔ لیکن وہ غرور کا بیان اس طرح کرتے ہیں کہ غرور کی حقیقت

[۱] لوقا ۱۵: ۱۲ کو دیکھو۔ [۲] تھسلنیکیوں کے دوسرے خط کے ۲: ۴ کو دیکھو۔ [۳] یوحنا ۵: ۳۰ و ۶: ۳۸ و ۸: ۵۰ کو دیکھو۔ [۴] رومیوں کے خط کے ۱۵: ۳ کو دیکھو +

Scanned by CamScanner

خدا کے عوض اپنے سے محبت رکھتی ہے" اور لوتھر اور کالوین اور اور مصلحوں نے بے ایمانی کو گناہ کی اصل کہا ہے لیکن بے ایمانی جیسا کہ اوپر ذکر ہوا خدا کو چھوڑ کر اپنے تئیں پسند کرنے سے نکلتی ہے۔

بعضوں کی رائے یہ ہے کہ گناہ کی دو اصلیں ہیں یعنی جسم اور خود غرضی۔ لیکن اُن کو یہ اقرار کرنا ضرور ہے کہ جسمانی گناہ کو خود غرضی لازم ہے اور خود غرضی کو جسمانی گناہ لازم نہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خود غرضی ہی اصل ہے۔

اب یہ دریافت کرنا چاہیئے کہ خود غرضی سے کس طرح ہر ایک قسم کا گناہ پیدا ہوتا ہے۔ پہلے یہ یاد رکھنا ضرور ہے کہ آدمی جب گناہ کرتا ہے تو اکثر جان بوجھ کر خود پسندی کو اپنا مقصد اور غرض نہیں بناتا بلکہ اُس حال میں بناتا ہے جب کہ گناہ میں بہت ترقی کر چکتا ہے۔ اور اکثر خود غرضی پوشیدہ اپنا اثر کرتی ہے۔

آدمی میں طرح طرح کی خواہشیں خدا کی طرف سے پیدا ہوئی ہیں۔ ان میں سے بعضی روحانی ہیں اور بعضی جسمانی۔ خواہشیں اس سبب سے ہیں کہ حاجتیں ہیں اور حاجتیں اس وجہ سے کہ آدمی مخلوق ہے۔

یہ خواہشیں دو قسم کی ہیں۔ پہلی قسم کی وہ ہیں جو اپنی حفاظت اپنی ترقی اپنی خوشی کے لئے ہیں۔ ان میں علم کی خواہش بھی شامل ہے۔ ان خواہشوں کو خود غرضی نہیں کہنا چاہیئے کیونکہ یہ خدا کی طرف سے ہیں اور ہر ایک کی ہستی کے لئے ضرور ہیں بلکہ ان کے بغیر محبت غیر ممکن ہے۔ اور نہ صرف اپنی حفاظت بلکہ اپنی ترقی کی بھی خواہش ضرور ہے کیونکہ جانداروں کی حفاظت بغیر اُن کی ترقی کے نہیں ہو سکتی۔ اور اپنی اس ترقی کے لئے یہ بھی ضرور ہے کہ دنیا کی چیزوں کو اپنے کام میں لانے

اور اپنے تابعدار کرنے کی خواہش ہو کیونکہ کوئی اپنے ہی سے سیر اور خوش نہیں ہو سکتا بلکہ اُس کے واسطے دنیا کی چیزیں ضرور ہیں +

دوسری قسم کی خواہشیں یہ دو ہیں۔ اول نیکی کرنے یعنی شریعت پر عمل کرنے کی خواہش جو تمیز یعنے شرعِ دانی سے پیدا ہوتی ہے۔ دوسری خدا کی خواہش جو خدا دانی سے پیدا ہوتی ہے پھر شریعت پر عمل کرنے کی خواہش میں تین خواہشیں شامل ہیں یعنے ایک تو اپنے تئیں دنیا سے آزاد رکھنے کی خواہش جس سے پرہیزگاری ہوشیاری اور دلیری پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے آدمیوں کے حق پہچاننے اور ادا کرنے کی خواہش تیسرے اپنے حقوق کا آدمیوں کے حقوق کے ساتھ محبت کی رو سے مقابلہ کر کے دونو کے ادا کرنے کی خواہش +

اس دوسری قسم کی خواہشوں کو پہلی قسم کی خواہشوں سے اس بات سے امتیاز ہے کہ وہ اپنے ہی واسطے ہیں اور یہ غیر یعنے خدا اور اُس کی شریعت کے واسطے ان خواہشوں کے بھی پورا کرنے سے خوشی حاصل ہوتی ہے لیکن یہ خوشی ان کا مقصد نہیں ہے +

حیوانوں میں صرف خواہشوں سے فوراً اور خواہ نخواہ کام ہوتے ہیں مگر آدمیوں میں ایسا نہیں ہوتا بلکہ ارادے کے وسیلے سے ہوتے ہیں۔ آدمی اپنی خود مختاری سے اپنے ارادہ کو اپنی خواہشوں پر جاری کر کے پیچھے اُن کو پورا کرتا یا اُن سے باز رہتا ہے۔ اسی سبب سے آدمی کے کام نیک یا بد کہلاتے ہیں +

پہلی قسم کی خواہشوں کو مار کر دوسری قسم کی خواہشوں کو پورا کرنا آدمی کی خوشحالی نہیں ہے۔ بلکہ یہ مناسب ہے کہ پہلی قسم کی خواہشیں دوسری قسم کی خواہشوں کی تابعدار رہیں۔ جیسا پولوس فرماتا ہے کہ "چاہیں کھائیں چاہیں پئیں چاہیں جو کچھ کریں سب خدا کے جلال کے لئے کریں" لیکن نہ

صرف تابعداری ہی چاہئے بلکہ دوسری قسم کی خواہشیں پہلی قسم کی خواہشوں کو گویا اپنے میں لے لیں۔ اور اُن کو اپنے وسیلے بنا کر اپنا کام کریں یہانتک کہ پہلی قسم کی کوئی خواہش اکیلی پوری نہ ہو۔ یہی مسیح کا حال تھا کہ خدا اور آدمیوں کی محبت میں وہ اور سب خواہشیں داخل کرتا تھا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کا کام دُنیا اور اُس کے کاروبار سے علیحدہ رہنا نہیں ہے بلکہ خدا کے پہلے حکم کے مطابق یہ ہے کہ خدا کی صورت پر ہو کر دُنیا کی حکومت کرے اور اُسے اپنے تابع کرے پیدائش ۱: ۲۶ کو دیکھو +

اِس حکومت کے لئے یہ ضرور ہے کہ آدمی دُنیا سے آزاد ہو اور اس آزادی کے واسطے یہ ضرور ہے کہ دُنیا سے ایک بالاتر عالم یعنے خدا کی مقارنت اُس کا مسکن و ماویٰ ہو۔ جب اُس کا یہ حال ہے تو وہ دُنیا میں ہر جگہ خدا کو دیکھتا ہے اور اپنے مقصد بھر دنیا کو خدا کی مرضی اور مطلب کے مطابق کر دیتا ہے۔ اسی طرح آدمی دُنیا پر حکومت کر سکتا ہے اور خدا کا کاہن ہوئے بغیر دُنیا کا بادشاہ نہیں ہو سکتا۔ جو آج کل دُنیا کی حکومت کہلاتی ہے یعنے ریل تار وغیرہ کے ذریعہ سے دُنیا کو ظاہری طور پر اپنا تابعدار کرنا اس حکومت کے ساتھ فی الحقیقت دنیا کی غلامی ممکن ہے بلکہ اگر آدمی اس پر کفایت کرتے ہیں تو اس سے دنیا کی غلامی بہت زیادہ ہی ہوتی ہے +

جب آدمی اپنی زندگی کے ازلی چشمہ سے جدا ہو کر اپنا ہی مالک ہونا اور اپنی ہی خوشی حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ دنیا کی چیزوں میں اپنے تئیں کھو دیتا ہے۔ جس پر اُس کو حکومت کرنی چاہئے وہ اب اس کا محکوم ہو گیا ہے اور اُس کی خواہشیں اپنے مقصد اور مرکز کو کھو کر پریشانی میں پڑی اور رنج و کد کی باعث ہوتی ہیں۔ آگے وہ حاکم تھا اب محکوم ہو گیا ہے۔

اب وہ دنیا کی چیزوں کو خدا سے الگ جان کر اُن کے حاصل کرنے میں کوشش کرتا ہے اور اُن میں پھنس جاتا ہے اور اُن سے اندھا ہو جاتا ہے۔ وہ گمان کرتا ہے کہ میں اُن پر حکومت کرتا ہوں لیکن فی الحقیقت اُن کا غلام بنتا ہے۔ اسی طرح خود غرضی کے ساتھ کوئی نہ کوئی دنیاوی خواہش ضرور پیدا ہوتی ہے۔ جیسا طیطس کے پہلے خط کے ۲: ۱۲ اور یوحنا کے پہلے خط کے ۲: ۱۷ سے معلوم ہوتا ہے یہ دنیاوی خواہش آدمی کو پھسلا کر اور مٹا کر اُس سے گناہ جنتی ہے جیسا کہ یعقوب اپنے خط کے ۱: ۱۴ و ۱۵ میں فرماتا ہے +

۱۔ اگرچہ ہر طرح کی دنیاوی خواہش سے خود غرضی ظاہر ہو سکتی ہے تاہم چونکہ آدمی نہ صرف رُوح بلکہ جسم ہے بھی بنا ہے جسمانی خواہش کا زیادہ خطرہ ہے۔ جب تک آدمی کی رُوح خدا کی تابعدار رہی اُس وقت تک اُس کا جسم اُس کی رُوح کا تابعدار رہا۔ اور فوراً اُس کے حکموں کو مانتا رہا لیکن جب سے آدمی کی رُوح نے خدا سے سرکشی کی اُس وقت سے اُس کے جسم نے اُس کی رُوح سے سرکشی کی بلکہ اُس کے برخلاف ایک طرح سے خود مختار ہو گیا جیسا کہ پولوس رومیوں کے خط ۷: ۲۳ میں فرماتا ہے "میں اپنے اعضا میں دوسری شریعت دیکھتا ہوں"+

جب یہ پھوٹ پڑ گئی تو پھر صلح ہوئی لیکن اس طرح کہ رُوح جسم کی تابعدار ہو گئی اور اُس کے حکموں کو ماننے لگی +

جب جسمانی خواہش کسی پر غالب آتی ہے تو دو طرح سے ظاہر ہوتی ہے یعنی جسمانی خوشی اور جسمانی آرام پیدا ہوتا ہے۔ جسمانی خوشی ایسی خواہش ہی تک رہتی ہے جہاں خواہش پوری ہو گئی خوشی جاتی رہی۔ اِس سبب سے جو اُس کی پیروی کرتے ہیں وہ ہمیشہ اَور زیادہ بے چینی میں گرفتار ہوتے ہیں اور اُن کو بے فائدہ کوشش کرنی پڑتی ہے۔ آرام کی خواہش میں سُستی بزدلی غفلت شامل ہے +

جب خود غرضی اس طرح جسمانی خواہشوں سے ظاہر ہوتی ہے تو اُن کے سبب آدمی سے پوشیدہ رہتی ہے کیونکہ آدمی جب ہمیشہ ایسی چیزوں کو ڈھونڈھتا رہتا ہے جن سے اُس کی خواہش پوری ہو تو اکثر یہ نہیں دیکھتا کہ میں اپنی پرستش کرتا ہوں۔ سو جسم کے سبب آدمی بالکل شیطان بن جانے سے رُک جاتا ہے اور جسمانی گناہ اور گناہوں کی نسبت کچھ چھوٹے ہیں +

۲۔ برعکس اس کے دولت اختیار اور عزت کی خواہشوں سے خود غرضی بہت ہی کم پوشیدہ رہتی ہے اور اسی سبب سے یہ گناہ زیادہ بڑے ہیں۔ جسمانی خواہشیں اکثر پل بھر کی خوشی بخشنے والی ہوتی ہیں لیکن یہ خواہشیں سوچنے اور بندوبست کرنے ہی سے پوری ہوتی ہیں پھر جسمانی خواہشیں اکثر دوسرے آدمیوں سے نہیں ٹکرتیں اور اس سبب سے اُن کی عداوت دل میں پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ جو لوگ باہم اُن خواہشوں کی پیروی کرتے ہیں اُن میں اکثر دوستی بھی ہوتی ہے لیکن یہ خواہشیں جہاں تک ایک کی پوری ہوتی ہیں وہاں تک دوسروں کی پوری نہیں ہو سکتیں۔ اس سبب سے دوسروں کی خواہشوں کو روکنا اور اُن کا نقصان کرنا اُس کو ضرور ہوتا ہے اور اس کا سبب بالکل پوشیدہ نہیں رہ سکتا یعنے یہ کہ وہ اپنے ہی واسطے یہ سب کچھ کرتا ہے

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ جسمانی خواہشوں کی خوب پیروی کرتے ہیں وہ اوروں کے ساتھ بہت مہربانی اور دردمندی کرتے ہیں اور خاص کر اپنے گھر والوں کے ساتھ۔ بے شک یہ خود غرضی تو ہے کیونکہ آدمی اپنے گھر والوں کو اپنے برابر دیکھتا ہے لیکن یہ محض خود غرضی نہیں ہے اس طرح آدمی کا جسم جو اُس کو خدا کا تابعدار ہونے سے روکتا ہے شیاطین کی طرح ہمیشہ کی لاعلاج خرابی میں پڑنے سے بھی اُسکو بچاتا ہے اور لالچی وغیرہ کی نسبت شہوت پرست کی

توبہ زیادہ آسان ہے کیونکہ وہ اپنی خرابی سے زیادہ واقف ہو سکتا ہے۔

۳۔ خود غرضی ایک طرح کا جھوٹھ بھی ہے کیونکہ جب تک آدمی خدا سے ملا ہوا تھا وہ اپنے سے بھی ملا ہوا تھا۔ اور اُس کی حقیقی زندگی تھی۔ جب وہ خدا کو چھوڑ کر خود غرض ہوا اُس وقت سے اُس کی زندگی جھوٹھی ہو گئی کیونکہ جیسی اُس کی ذات ہے ویسا اُس کا حال نہیں ہے۔ وہ دُنیا میں ہمیشہ اپنی خوشی اور آسودگی ڈھونڈھتا ہے لیکن اُن کے ملنے سے اُس کی پیاس جوں کی توں رہتی ہے۔ وہ تلاش میں اَور چیز کی ہے اور ملتی اَور چیز ہے۔ یہ جھوٹھ کبھی کبھی کم و بیش اُس کو معلوم بھی ہوتا ہے۔ مقدس کتاب کی گواہی بھی اسی طرح ہے۔ جو لوگ سچائی کے ساتھ منسوب ہوتے ہیں وہی خدا کے ساتھ بھی منسوب ہوتے ہیں۔ یوحنا کے ۸: ۴۷۔ اور ۱۸: ۳۷۔ اور یوحنا کے پہلے خط کے ۳: ۱۹۔ اور ۴: ۴ اور ۶ کو دیکھو۔ بہت سی جگہ گناہ کو فریب یا فریب دینے والا کہا گیا ہے مثلاً رومیوں کے خط کے ۷: ۱۱۔ اور کرنتھیوں کے دوسرے خط کے ۱۱: ۳۔ اور افسیوں کے خط کے ۴: ۲۲۔ اور تیمتھیس کے پہلے خط کے ۲: ۱۴ اور عبرانیوں کے خط کے ۳: ۱۳ میں۔ اور جہاں مسیح نے ابلیس کو آدمی کا ہلاک کرنے والا کہا وہاں یہ بھی کہا کہ "اُس میں سچائی نہیں ہے وہ جھوٹھا ہے اور جھوٹھ کا باپ"۔ یوحنا کے ۸: ۴۴ کو دیکھو۔

لیکن اس بات سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ گناہ آدمی کا قصور نہیں ہے کیونکہ یہ جھوٹھ اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ آدمی بدی کو نیکی سمجھتا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ خدا سے الگ دُنیا کو اپنی خوشی کا باعث جانتا ہے لیکن اُس کی یہ خوشی چاہنی بُری ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ آدمی کا اپنی خوشی کرنے سے ناپسند کرنا کچھ تعجب کی بات نہیں ہے۔ لیکن اسی کو پسند

کرنے سے آدمی کی خرابی ظاہر ہوتی ہے۔ آدمی پہلے خود غرضی سے بگڑتا ہے پیچھے گناہ سے فریب کھاتا ہے نہ یہ کہ گناہ سے فریب کھا کر خود غرض ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ امید بے بنیاد ہے کہ جب یہ دھوکا جاتا رہیگا گناہ آپ سے آپ دور ہو جائیگا۔ ممکن ہے کہ آدمی گناہ کے دھوکے سے بالکلیہ آگاہ ہو اور پھر بھی اُس کا تابعدار رہے کیونکہ جاننا اَور ہے اور کرنا اَور ہے۔ عقل سے دل نہیں بدلتا۔ بہت سے لوگ گناہ کی بطالت کو خوب جانتے ہیں اور پھر بھی اُس میں آلودہ ہوتے جاتے ہیں۔ مسیح نے بیشک کہا ہے کہ "تم حق کو جانو گے اور حق تم کو آزاد کریگا" لیکن یہ اس کے کلام پر قائم رہنے پر موقوف ہے یوحنا کے ۸: ۳۱ اور ۳۲ کو دیکھو +

چونکہ خود غرضی اپنی ذات ہی سے جھوٹھ ہے اس لئے اُس سے دروغ گوئی اور دروغ سازی بھی پیدا ہوتی ہے۔ تھوڑے آدمی تو ایسے ہونگے کہ اُن کو اَور آدمیوں کی طرف کچھ احتیاج نہ ہو اور دروغ کی کچھ ضرورت نہ پڑے بلکہ وہ اپنی خود غرضی کو بے شرمی سے ظاہر کرتے ہیں لیکن اکثر آدمیوں کو اَور آدمیوں کی مدد ہزاروں طرح سے درکار ہوتی ہے اس واسطے اپنی خود غرضی کو چھپا کر ہزاروں طرح سے فریب دینا انہیں ضرور ہوتا ہے۔ دروغ جو خود غرضی کا بچہ ہے پیچھے بڑا ہو کر اپنی ماں سے جدا ہو جاتا ہے یہانتک کہ جہاں کچھ مطلب نہیں ہوتا وہاں بھی آدمی جھوٹھ بولتے ہیں اور آخر کو سچ اور جھوٹ کی پہچان بھی کھو دیتے ہیں +

سب گناہوں سے زیادہ غرور میں خود غرضی ظاہر ہوتی ہے۔ لالچ جھوٹھ اور عداوت میں آدمی کے خیال کو اَور کی طرف جاتے ہیں لیکن مغرور آدمی اَوروں سے قطع نظر کر کے اپنی ہی بڑائی کرتا ہے

گویا آدمیوں کا حاجتمند ہی نہیں ہے۔ جو دنیا کی ظاہری چیزوں کے سبب سے غرور کرتا ہے وہ صرف اسی واسطے نادان ہے کہ وہ چیزیں ناپائدار ہیں۔ لیکن جو باطنی چیزوں مثلاً علم تاثیر کلام نیک اعمال روحانی حال وغیرہ کے سبب غرور کرتا ہے یہ اس کی نسبت بہت زیادہ نادان ہے کیونکہ ان چیزوں میں سب شریک ہو سکتے ہیں۔ آدمی کی خرابی اس سے صاف ظاہر ہے کہ خدا کے جس علاقہ سے فروتنی پیدا ہونی چاہئے اس سے اُلٹا غرور پیدا ہوتا ہے اور خود فروتنی میں بھی غرور کا بیج چھپا ہوا ہے جو آگ کر فروتنی کو نیست کر سکتا ہے۔ جب مغرور آدمی کو اپنے سے کمتر لوگوں سے کام پڑتا ہے تو وہ ظالم ہو جاتا ہے اور جب اپنے سے برتر سے پڑتا ہے تو خوشامدی ہو جاتا ہے +

۵ خالص انصاف تو محبت ہی سے پیدا ہوتا ہے کیونکہ وہی کسی کے ساتھ خالص انصاف کر سکتا ہے جو محبت کے سبب اپنا حال ویسا ہی خیال کرتا ہے جیسا دوسرے آدمی کا ہے۔ لیکن جہاں محبت نہیں ہے وہاں بھی اکثر انصاف کا کچھ لحاظ پایا جاتا ہے۔ اس واسطے جو بالکل بے انصاف ہے اور اپنے ہی حقوق کی فکر کرتا ہے اور آدمیوں کو گویا بے حق سمجھتا ہے اور گویا اپنے ہی تئیں شخص اور آدمیوں کو حیوان جانتا ہے اس میں خود غرضی نے بڑی ترقی کی ہے +

۶ خود غرضی سے عداوت بھی پیدا ہوتی ہے بلکہ خود غرضی جب کہ اور آدمیوں کی مزاحمت سے بھڑک اٹھتی ہے تو خود عداوت ہو جاتی ہے بے انصاف اسی حالت میں آدمیوں کا نقصان کرتا ہے جب اُن سے اُس کی خواہشیں رُکتی ہیں لیکن عداوت کرنے والا بیفائدہ بھی آدمیوں کا نقصان کرنے لگتا ہے۔ ہاں ایسے تو خود غرض لوگ ہوتے ہیں کہ خود غرضی کے سبب عداوت رکھنے سے باز آتے ہیں اور یہ دو طرح سے ہوتا ہے

بعض لوگ تو یہانتک اپنے نفع یا اپنی بڑائی کی فکر و بندوبست کرتے ہیں کہ جب عداوت کرنے سے اُن کے مطلب پورے نہیں ہوتے تو وہ اُس سے باز آتے ہیں لیکن اُن کے دل میں عداوت جوں کی توں رہتی ہے اور جب موقع ملتا ہے تو اُس وقت ظاہر بھی ہو جاتی ہے۔ اور بعضے لوگ یہانتک آرام کے خواہاں ہوتے ہیں کہ صرف اس خیال سے عداوت رکھنے سے باز رہتے ہیں کہ اس سے طرح طرح کی تکلیف اور بے آرامی ہوگی۔ لیکن اُن کے دلوں میں محض خود غرضی حکومت کرتی ہے +

عداوت نہ صرف آدمیوں کے ساتھ بلکہ خدا کے ساتھ بھی ہوتی ہے۔ جب خود غرضی کسی پر غالب ہو جاتی ہے تو بھی خدا دانی جاتی نہیں رہتی اور اگر خدا دانی و شرع دانی کے بیچ میں جو علاقہ ہے وہ جھوٹے مذہب کے سبب ٹوٹ نہیں گیا یعنے اگر آدمی خدا کو نیک اور نیکی کا چاہنے والا اور بدی سے نفرت کرنے والا سمجھے تو خود غرضی خدا دانی کو نہایت مزاحم سمجھتی ہے اور یہ چاہتی ہے کہ خدا نہ ہوتا۔ جتنا زیادہ کسی نے خدا کو پہچانا اور اُس کی مقدسیت کا مزا چکھا اگر اُس سے پھر جائے تو اُتنا ہی اُس سے غافل رہنا مشکل ہے اور اُتنی ہی اُس کی عداوت پیدا ہوتی ہے (یوحنا ۳: ۲۰- اور ۱۵: ۲۴ کو دیکھو۔ چنانچہ ان دنوں یورپ میں بعض کی رائے یہ ہے کہ خدا سے عداوت رکھنے کے سبب اُس سے محبت رکھنے کے سببوں سے زیادہ ہیں بلکہ ایسی جماعتیں ہیں کہ جن کے شریک یہ دعوہ کرتے ہیں کہ ہم خدا سے دشمنی رکھیں گے +

جیسا جھوٹھ کا بیان اوپر ہوا ویسا ہی عداوت کا حال ہے یعنے عداوت نہ صرف اُس حالت میں ہوتی ہے جب خود غرضی کسی

دوسرے آدمی سے رُک جاتی ہے بلکہ اپنی پیدائش کے سبب گویا بچل کر بالکل بے سبب بھی ہوتی ہے یعنے آدمی شیفا شدہ بھی اوروں کو دُکھ دینے اور اُن کے دُکھ دیکھنے سے خوش ہوتے ہیں۔ یہ تو سچ ہے کہ جو کچھ آدمی پسند کرتا ہے اُسے اچھا سمجھ کر پسند کرتا ہے اور جو کچھ وہ ناپسند کرتا ہے اُسے بُرا سمجھ کر ناپسند کرتا ہے۔ لیکن آدمی کی خرابی اسی سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ اَوروں کے دُکھ کو نرا اچھا سمجھتا ہے۔

بہت لوگوں کی رائے ہے کہ شہوت پرستی اور بے رحمی آپس میں ضد ہیں۔ لیکن برعکس اس کے ان دونوں میں بڑا علاقہ ہے۔ ایک تو یہ کہ شہوت پرست آسانی سے اپنے معشوق کو بلکہ اپنے جسم کو بھی بیرحمی سے ہلاک کر سکتا ہے دوسرے یہ کہ اَوروں سے بیرحمی کرنے اور انہیں ہلاک کرنے سے ایک طرح کی جسمانی خوشی پیدا ہوتی ہے۔

مسیح نے جو ابلیس کو خونی اور جھوٹھا کہا اس سے اُس نے عداوت اور جھوٹ کو اصلی گناہ ٹھیرایا۔ یہ دونو خود غرضی سے اس طرح پیدا ہوتے ہیں کہ جب اُس کے ساتھ خوف ہوتا ہے تو جھوٹھ پیدا ہوتا ہے اور جب اُس کے ساتھ ہمت ہوتی ہے تو عداوت پیدا ہوتی ہے۔ اور پھر عداوت جھوٹ سے پیدا ہوتی ہے اس لئے کہ خدا حق کا طرفدار ہے اور جھوٹھ عداوت سے پیدا ہوتا ہے اس لئے کہ جھوٹ کے وسیلہ سے عداوت کامیاب ہوتی ہے۔

۷۔ اِسی طرح سے وہ گناہ بھی جو عقل سے تعلق رکھتے ہیں اسی خود غرضی سے نکلتے ہیں کیونکہ عقل دل کی حالت پر بہت موقوف ہے جس طرح وہ جواب جو کسی شے کی حقیقت کی نسبت ملیں اُس شے کی

لہ سالوطیقس یعنی کتاب کے [illegible] کو دیکھو۔

حقیقت کے سوالوں پر موقوف ہیں اسی طرح وہ سوال بھی دل کی حالت پر بہت موقوف ہوتے ہیں اور دل اور عقل کا یہ علاقہ محض عقلی باتوں کی طرح منطق کے قاعدوں کا پابند نہیں ہے۔ ہاں یہ علاقہ علم کی سب باتوں میں یکساں نہیں ہے بلکہ جتنی وہ زیادہ خیالی ہیں اُتنا ہی یہ علاقہ کم ہے۔ مثلاً علم ریاضی جو بالکل خیالی ہے دل کی حالت پر کچھ بھی موقوف نہیں۔ لیکن علم کی باتیں خود آدمی سے اور خاصکر اُس کی حقیقت سے جو رُوح ہے جتنی زیادہ نسبت رکھتی ہیں اتنی ہی زیادہ عقل پر موقوف معلوم ہوتی ہے بلکہ دینی باتیں دل ہی کے راستہ سے عقل کو پہنچتی ہیں۔ چنانچہ پہلے انہیں پسند کرنا ہوتا ہے اور اس کے بعد سمجھنا۔ سب سے زیادہ مسیحی دین کا یہ حال ہے۔ یوحنا کے ۱: ۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ کلام اللہ آدمی کا نور صرف اس لئے ہے کہ وہ آدمی کی زندگی ہے۔ یوحنا کے ۷: ۱۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کوئی خدا کی مرضی پر عمل کرنے کی خواہش رکھے وہی مسیح کی تعلیم مانے گا۔ یوحنا کے ۸: ۴۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس کا دل خدا کی طرف نہیں وہ خدا کا کلام قبول نہیں کرسکتا۔ کرنتھیوں کے پہلے خط کے ۲: ۱۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ نفس پرست آدمی خدا کی رُوح کی باتیں قبول نہیں کرسکتا۔ جو کوئی اپنی خواہشوں کو خدا کی شریعت کے مطابق نہیں کرتا۔ وہ خدا کی شریعت کو اپنی خواہشوں کے مطابق کرنے میں کوشش کرتا ہے۔ مسیح اپنی تعلیم کی سچائی کو اپنی بیگناہی پر موقوف کرتا تھا یوحنا کے ۸: ۴۶ کو دیکھو۔ پروتاگوارا ایک پرانے یونانی فیلسوف نے تمام بنی آدم کے حق میں کہا کہ "انسان سب چیزوں کا پیمانہ ہے"۔ مگر یہ فی الحقیقت مسیح ہی پر صادق آتا ہے +

۸۔ دو گناہ اور بھی ہیں جو معاملات سے نسبت رکھتے ہیں یعنی بیوقوفی اور بےتدبیری۔ بیوقوفی ناجائز مقصدوں کو پسند کرتا ہے۔ اور

Scanned by CamScanner

بے تدبیری کسی مقصد کے واسطے نامناسب تدبیر کرنی۔ خود غرضی محض بیوقوفی ہے کیونکہ اگر کوئی شخص خدا کا خیال چھوڑ کر اپنے ہی فائدہ اور ترقی کے واسطے نہایت ہوشیاری سے بھی تدبیریں سوچے اور انہیں عمل میں بھی لائے مگر جب کہ اُس کا مقصد ہی نہایت کمتر اور ناچیز ہے تو اُس میں دانائی کہاں؟

بے تدبیری فی الحقیقت کم عقلی کا نتیجہ نہیں ہے کیونکہ جو کم عقل آدمی خود غرضی سے اندھا نہ ہوا ہو اور اپنی کم عقلی کو سمجھتا ہو وہ اُن کاموں کو جنہیں وہ درستی سے نہیں کر سکتا اپنے ذمہ نہ لیگا پس بے تدبیری خواہ سستی کا نتیجہ ہو خواہ غرور و جلد بازی کا دونو صورتوں میں خود غرضی سے پیدا ہوتی ہے۔ لوقا ۱۲: ۲۰ اور ۱۶: ۸ کو دیکھو +

گناہ دو قسم کا ہے ایک دائمی حالت کا اور دوسرا کسی خاص وقت کا کام۔ مقدس کتاب میں اکثر گناہ کے یہ دوسرے معنے لئے گئے ہیں لیکن رومیوں کے خط میں ۵: ۱۲ سے ۸ باب تک اور خصوصاً ۶ باب کی ۱۴ آیت سے ۲۵ تک پہلے معنے مراد ہیں۔ دوسری قسم کا گناہ دو طرح کا ہے بالعمد اور بلاعمد۔ البتہ جو شریعت کے برخلاف ہے وہ گناہ ہے بشرطیکہ آدمی اُس شریعت کو سمجھتا ہو۔ ہر طرح کے گناہ کی بنیاد آدمی کی خود مختاری میں ڈالی گئی ہے لیکن پھر بھی ہر ایک گناہ جس وقت کیا جاتا ہے عمداً نہیں کیا جاتا۔ مثلاً دوسرے آدمی کی اقبالمندی سے جو حسد ہوتا ہے اور شہوت اور غضب کی جو حرکتیں دل میں آپ سے آپ پیدا ہوتی ہیں وہ گناہ کی دائمی حالت سے نکلتی ہیں اور بے شک گناہ ہیں۔ اور اسی طرح جو ہم پر فرض ہے اُسے نہ کرنا اگر اُس میں عمداً شریعت کی مخالفت نہ ہو گناہ ہے۔

اگرچہ خود غرضی فی الحقیقت سارے گناہوں کی اصل ہے پھر بھی

ممکن ہے کہ کوئی آدمی اپنی غرض کے خیال سے نہیں بلکہ اَوروں کے فائدہ کے واسطے گناہ کرے مثلاً غریبوں کو کھلانے کے واسطے امیروں کا مال چرائے اگر کوئی کہے کہ ایسا کام گناہ نہیں ہے تو شاید کوئی گناہ بھی ایسا نہ ہوگا جس میں کسی نہ کسی طرح کا عذر نہ نکل سکے۔ گو بارہا ایسے خیالوں سے گنہگار کا قصور کم معلوم ہوتا ہے لیکن وہ گناہ ضرور ہے اور اُس کی خود غرضی اس سے ظاہر ہے کہ اُس نے اَوروں کو فائدہ پہنچانے میں اپنی ہی رائے کو شریعت کے احکام سے زیادہ پسند کیا۔

دوسرا حصہ گناہ کی قصورواری

چوتھا باب

قصورواری کی ماہیت

اب یہ دو باتیں تو ثابت ہو چکیں کہ نیکی وہ ہے جو ہونی چاہیے اور بدی وہ ہے جو نہ ہونی چاہئے۔ لیکن یہ اُن کی تعریف نہیں ہے۔ خوش سلیقگی اور شائستگی بھی وہ ہے جو ہونی چاہئے اور بدسلیقگی اور ناشائستگی وہ ہے جو نہ ہونی چاہئے البتہ نیکی اور خوش سلیقگی اور بدی اور بدسلیقگی کے خیالات میں بڑا علاقہ ہے کیونکہ آدمی خود بخود سمجھتا ہے کہ نیکی ظاہر میں بھی نیک اور بدی ظاہر میں بھی بد ہونی چاہئے۔ لیکن پھر بھی انمیں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جس آدمی کو خوش سلیقگی کا شوق نہیں ہے اُس پر عیب نہیں لگایا جاتا لیکن جس کو نیکی کا شوق نہیں اُس پر ضرور عیب لگایا جاتا ہے اور وہ معذور نہیں ہوتا کیونکہ نیکی سب آدمیوں پر برابر فرض ہے پھر بدسلیقگی یا ناشائستگی کا کام فاعل پر موقوف نہیں ہے گو فاعل کیسا ہی کیوں نہ ہو اُس کام میں بدسلیقگی یا ناشائستگی

Scanned by CamScanner

میں خلل نہیں آئیگا - لیکن گناہ ہمیشہ گنہگار پر موقوف ہے بلکہ اس سے الگ ہو کر گناہ نہیں ہے پس ہم اس علاقہ کو جو گناہ اپنے فاعل سے رکھتا ہے اُس کی قصور رواری کہتے ہیں - یعنے جب گناہ ہوا تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ جو ہوا سو ہوا اب کچھ اس کا فکر نہیں - بلکہ اُس کا فاعل اس کے سبب سے قصور وار ہے اور فاعل کی قصور رواری یعنے وہ علاقہ جو وہ اپنے گناہ سے رکھتا ہے جاتی نہیں رہتی - گناہ تو دم بھر میں ہو چکا لیکن اُس میں جو قصور رواری ہے وہ دائمی ہے +

قصور رواری کے خیال میں دو باتیں شامل ہیں - ایک یہ کہ گنہگار اپنے گناہ کا بانی ہے - اور گناہ صرف گنہگار کا نتیجہ نہیں بلکہ اُس کا کام بھی ہے - اسی واسطے وہ اُس کا جواب دہ ہے - یہ کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ میرا کام تو بد ہے لیکن میں بد نہیں ہوں +

دوسرے یہ کہ گنہگار اپنے گناہ کے سبب مستوجب سزا ہے - عہدنامہ جدید میں گناہ کی قصور رواری کو قرض کے مشابہ لکھا ہے متی کے ۶: ۱۲ اور لوقا کے ۷: ۴۱ - اور ۱۲: ۵۹ - اور ۱۳: ۴ کو دیکھو - عہدنامہ عتیق میں گناہ کی مغفرت ایسے لفظوں کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ جن کے اصلی معنی اُٹھا لیجانا چھپانا اور ڈھانکنا ہیں - ان سب استعمالوں سے صاف ظاہر ہے کہ بائیبل کے موافق بھی گناہ کی قصور رواری ہے +

اب یہ شک پیدا ہوتا ہے کہ کیا سب گناہوں کی قصور رواری برابر ہے ستوئک لوگوں کی تو یہی رائے تھی لیکن علی العموم انسان کی تمیز اس سے انکار کرتی ہے اور موسوی شریعت میں جو مختلف گناہوں کے واسطے مختلف کفارے مقرر ہوئے اس سے اور متی کے ۵: ۲۱ اور ۲۲ اور ۱۰: ۱۵ اور ۱۲: ۳۱ اور ۳۲ اور لوقا کے ۱۲: ۴۷ اور ۴۸ اور یوحنا کے ۱۹: ۱۱ اور یوحنا کے پہلے خط کے ۵: ۱۶ سے صاف ظاہر ہے کہ

کہ بائبل بھی اس سے انکار کرتی ہے ؛

پس قصورواریوں میں کیا فرق ہوگا؟ گناہوں کی دو قسمیں جو مسلمانوں نے کبیرہ و صغیرہ اور رومی کلیسیا والوں نے مہلک اور قابل العفو ٹھہرائی ہیں یہ تو نادانی ہے اور بڑے نقصان کا بھی باعث ہے کیونکہ ایک تو قصورواری کے درجے ہی دو سے زیادہ بلکہ بیشمار ہیں دوسرے اِس طرح کی تقسیم میں گناہ کی صرف ظاہری صورت پر نظر ہوتی ہے ؛

قصورواری کا فرق دو طرح سے دریافت ہوتا ہے ایک یہ کہ گناہ کس قدر قصداً کیا گیا دوسرے یہ کہ خودغرضی کس قدر اُس سے ظاہر ہوئی۔ پھر قصورواری صرف قصد کی مقدار ہی پر موقوف نہیں ہے بلکہ خود گناہ کے بھی درجے ہیں۔ بالکلیہ جوابدہی کے لئے ضرور ہے کہ آدمی گناہ بالکلیہ خودمختاری سے اور اُس کو بالکل گناہ ہی جان کر کرے۔ پس جس قدر ان دونوں میں سے کوئی کم ہوگا قصورواری بھی کم ہوگی ؛

اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ نادانی سے تمام گناہ کی قصورواری دور ہو جاتی ہے۔ لیکن نادانی دو طرح کی ہے ایک صغرٰے[1] یعنے امورِ دنیوی میں دوسری کبرٰے یعنے امورِ شریعت میں مثلاً دو آدمیوں کی دو ہمشکل چیزیں ہیں ان میں سے ایک آدمی دوسرے کی چیز کو اپنی سمجھ کر لے تو یہ چوری نہیں ہے اور نہ اُس کی کچھ قصورواری ہے۔ اور جس صورت میں کہ وہ سوچنے اور پوچھنے سے جان سکتا ہے کہ یہ میری چیز نہیں ہے۔

---

[1] آدمی کی تمیز میں ایک طرح کی شکل بدیہی الانتاج پیدا ہوتی ہے مثلاً

صغرٰے۔ یہ کام کرنا چوری کرنی ہے۔

کبرٰے۔ چوری کرنی ناجائز ہے۔

نتیجہ۔ پس یہ کام کرنا ناجائز ہے۔

یہاں کبرٰے شریعت سے معلوم ہوتا ہے اور صغرٰے امورِ دنیوی سے ؛

Scanned by CamScanner

تو اُس کی کچھ قصورواری ہے۔ اور جتنا یہ دریافت کرنا آسان ہے اُتنی ہی قصورواری بھی زیادہ ہے۔ لیکن امورِ دنیوی کی نادانی سے جو قصورواری ہوتی ہے وہ اُس قصورواری سے کم ہے جو امورِ شریعت کی نادانی سے ہوتی ہے۔ پھر یہ نادانی بھی یکساں نہیں ہے۔ جن آدمیوں کی تمیز اُن کی بچپن کی تعلیم سے تاریک ہوئی ہو اُن کی قصورواری اُن لوگوں کی قصورواری سے کم ہے جنھوں نے اپنی ہی بدچلنی سے اپنی تمیز کو تاریک کر دیا ہو۔ اور اگر کوئی آدمی جب سے کہ تمیز کی آواز اُس کے کان میں پہنچی اُس کی فرمانبرداری کرتا تو اُس کی تمیز رفتہ رفتہ روشن ہو جاتی اور امورِ شریعت کی نادانی کم۔ اسی واسطے جو لوگ غیر مذہب سے مسیحی مذہب میں آتے ہیں وہ اپنی جہالت کے وقت کے گناہوں کے سبب سے اپنے تئیں قصوروار سمجھتے ہیں۔ البتہ بائبل غیر مذہب والوں کی قصورواری کو بہت کم ٹھہراتی ہے۔ متی کے ۱۱: ۲۰ سے ۲۴ تک اور اعمال کے ۱۷: ۳۰۔ اور رومیوں کے خط کے ۲: ۹ کو دیکھو لیکن قصورواری اُن کی بھی ضرور ہے اُن کے دلوں میں اصلی خدادانی ہے اور وہ خدا کے کاموں سے جو دنیا میں ہوتے ہیں تازہ ہوتی ہے اعمال کے ۱۴: ۱۶ و ۱۷۔ اور ۱۷: ۲۴ سے ۲۹ تک اور رومیوں کے خط کے ۱: ۱۹ و ۲۰۔ اور ۱: ۲۱ و ۲۲۔ اور ۲: ۱۵ اور ۳: ۲۳ کو دیکھو۔ پولس جب اپنے پچھلے حال کا ذکر کرتا ہے تو کہتا ہے کہ میں اُس وقت نادان تھا لیکن پھر بھی اپنے تئیں اوّل درجہ کا گنہگار ٹھہراتا ہے۔ اور اُس رحمت اور تحمل کا جو خدا نے اُس پر ظاہر کیا شکر کرتا ہے۔ تیمتھیس کے پہلے خط کے ۱: ۱۲ سے ۱۶ تک دیکھو۔

رومیوں کے خط کے ۲: ۱۴ و ۱۵ سے بعضے لوگوں نے سمجھا ہے کہ پولس کی رائے میں قصورواری بالکل گنہگار کی تمیز پر موقوف ہے۔ لیکن پولس نے یہ نہیں لکھا کہ جو کچھ ایمان سے ہے وہ نیک ہے بلکہ یہ لکھا ہے کہ

جو کچھ ایمان سے نہیں وہ گناہ ہے۔ یہ تو سچ ہے کہ جو کچھ تمیز علم دے اُس کا کرنا لازم ہے اور نہ کرنا گناہ ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اُس کا کرنا ہمیشہ نیک ہے۔ گناہ کے ساتھ یہ ایک سخت خرابی لگی ہوئی ہے کہ جب تمیز اُس کے سبب سے بگڑ گئی تو کرنا اور نہ کرنا دونو گناہ ہیں۔ جنہوں نے خدا[1] کی بندگی سمجھ کر حواریوں کو قتل کیا اُنہوں نے گناہ کیا لیکن اگر وہ اُنکو قتل نہ کرتے تو بھی گناہ اُن پر رہتا۔

مسیح نے بے ایمان یہودیوں کے حق میں کہا کہ "اگر[2] میں آکر اُن سے نہ بولتا...... تو وہ گنہگار نہ ہوتے۔" صاف ظاہر ہے کہ اس کے معنے یہ ہیں کہ اس گناہ کی (یعنے مسیح کو رد کرنے کی) قصورواری اُن سے نہ ہوتی کیونکہ یوحنا کے ۳ : ۳۶ میں بے ایمان کے حق میں لکھا ہے کہ "خدا کا قہر اُس پر قائم رہتا ہے۔" اور یوحنا کے ۹ : ۴۱ سے ظاہر ہے کہ وہ لوگ کسی قدر مسیح کی تعلیم کو سمجھتے بھی تھے بالکل نادان نہ تھے۔ لوقا کے ۱۲ : ۴۷ اور ۴۸ سے ظاہر ہے کہ دانائی اور نادانی سے قصورواری کے صرف درجے ہی کا فرق ہوتا ہے۔ مسیح نے اپنے قاتلوں کے حق میں یہ کہا ہے کہ "وہ نہیں جانتے تھے کہ کیا کرتے ہیں" لیکن اگر وہ اُنہیں بالکل بے قصور سمجھتا تو یہ کیوں کہتا کہ "اے باپ اُنہیں معاف کر" ان سب باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ داؤد نے جو[3] دعا مانگی کہ "غیر معلوم باتوں سے مجھے بے قصوروار ٹھہرا" وہ صرف یہودیوں کے لئے نہیں بلکہ ہمارے اور اور سب لوگوں کے لئے بھی نہایت مناسب دعا ہے۔

قصورواری اور اُس کی واقفیت میں بڑا فرق ہے۔ قصورواری اور اُس کی واقفیت یہ دونو بالکل علیحدہ ہیں یعنے اگر آدمی اپنے تئیں

---

[1] یوحنا کے ۱۶ : ۲ کو دیکھو۔
[2] یوحنا کے ۱۵ : ۲۲ اور ۲۴ کو دیکھو۔ [3] زبور ۱۹ : ۱۲ کو دیکھو۔

Scanned by CamScanner

مطلق قصوروار نہ جانتا تو بھی اُس کی قصوروارہی میں کچھ فرق نہ آتا۔ کیونکہ جب شریعت یہ فرمان جاری کرتی ہے کہ "یہ چاہئے" تو جہاں اُسکی فرمانبرداری نہیں ہوئی وہاں دوسرا فرمان ضرور جاری ہوگا کہ "یہ چاہئے تھا"۔ یعنی آدمی قصوروار ہے۔ آدمی شروع ہی سے شریعت کا قرضدار ہے۔ لیکن گناہ کرنے سے یہ قرضداری ہمیشہ قائم رہتی ہے +

مگر معلوم ہوتا ہے کہ بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں کہ جن کو اپنی قصوروارہی کی واقفیت مطلق نہ ہو۔ جہاں کہیں شریعت کی کچھ واقفیت رہے وہاں قصوروارہی کی بھی کم و بیش واقفیت رہنی ضرور ہے +

پھر بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ جہاں گناہ ہے وہاں اُس کی قصوروارہی کی واقفیت بھی ہے۔ برعکس اس کے اکثر لوگ جب عام گناہ کرتے ہیں تو اپنے تئیں کچھ بھی قصوروار نہیں جانتے اور صرف اُسوقت اپنے تئیں قصوروار جانتے ہیں جبکہ اُن سے کوئی عجیب یا خلاف قاعدہ گناہ ہوتا ہے +

مگر جس کو قصوروارہی کی بالکلیہ واقفیت نہیں ہے اُس کے بھی دل میں ایک طرح کا اضطراب رہتا ہے کیونکہ خود غرض آدمی کو پوری تسلی نہیں ہو سکتی اور کبھی کبھی وہ اپنے خطرناک حال کو پہچان کر گھبراتا ہے +

توبہ میں اور قصوروارہی کی واقفیت میں بڑا فرق ہے۔ قصوروارہی کی واقفیت خواہ مخواہ ہوتی ہے۔ آدمی اُس کو پیدا نہیں کرتا بلکہ وہ آدمی میں خود پیدا ہو کر اُس کو اپنے قبضہ میں رکھتی ہے۔ اور انہیں جو شریعت کی پابندی کو سچ جانتے ہیں بغیر ظاہر ہوئے اپنا پابند رکھتی ہے بلکہ کبھی کبھی ایسا زور کرتی ہے کہ آدمی کو خود اپنے گناہ کا اقرار کر کے اُس کی سزا آدمیوں سے پانی ضرور ہوتی ہے۔ برعکس اس کے

توبہ آدمی کا فعل ہے جو وہ خود مختار ہو کر کرتا ہے۔ تائب آدمی قصورواری کی واقفیت کے دکھ کو واجب سمجھ کر اُس کو قبول کر لیتا ہے۔ توبہ نجات کا پہلا کام اور خدا کی طرف پھرنے کا پہلا کام ہے کرنتھیوں کے پہلے خط کے ۷: ۹ سے ۱۱ تک دیکھو۔ وہاں جو دُنیاوی غم مذکور ہے اُس میں قصورواری کی واقفیت کا دکھ شامل ہے مگر جب توبہ اُس کے ساتھ ہو جاتی ہے تو عقباوی غم ہو جاتا ہے۔ ورنہ پشیمانی ہی رہتی ہے جو یہودا اسکریوتی سے بھی ہوئی۔ اور توبہ یہی ہے۔

پانچواں باب

خدا کی پروردگاری اور آدمی کی قصورواری

اگرچہ گناہ کی قصورواری کی واقفیت خود قصورواری سے بہت کم ہوئی ہے پھر بھی قصورواری اُسی واقفیت سے ثابت ہو سکتی ہے۔ ہم اسی واسطے اپنے تئیں قصوروار سمجھتے ہیں کہ ہمارا دل اس پر گواہی دیتا ہے۔ مگر پھر بھی یہ یقین کرنا آسان نہیں ہے کیونکہ عقل اس کے خلاف بہت سی قوی دلیلیں لاتی ہے۔ مثلاً چونکہ خدا ہر جگہ حاضر ہے اور بغیر اُس کے سہارے کے کچھ نہیں ہو سکتا تو جو کچھ آدمی سے بھی نیکی یا بدی ہوتی ہے کیا خدا اُس میں شریک نہیں ہے؟ لیکن اگر ہم اس دلیل کے سبب سے اپنی قصورواری کی واقفیت کو غلط سمجھیں تو گناہ کی بدی بھی کس طرح ثابت ہو گی یعنی اگر خدا فی الحقیقت ہمارے گناہ کا بانی ٹھیرے تو کیا گناہ سے نفرت کرنی چاہئے؟ کیا نیکی اور بدی دونو کو پسند نہ کرنا چاہئے؟ لیکن اس حال میں تو نیکی اور بدی میں کچھ فرق نہ رہیگا۔ شاید اس کا جواب یہ ہو کہ خدا دونو کا بانی تو ہے لیکن چونکہ اُسے بدی نیکی سے کم پسند آتی ہے

اس واسطے اُس نے بدی کے ساتھ قصوروار ی کی واقفیت کا دُکھ لگا دیا تاکہ آدمی اُسی کی پیروی کرے جو خدا کو زیادہ پسند ہے۔ لیکن یہ ظلم و بیرحمی کی بات ہے کہ خدا بدی تو آپ کرے اور اُسکی سزا اور دُکھ اوروں کو دے۔ پس اس صورت میں خدا (نعوذ باللہ) ظالم اور بے رحم ٹھیریگا۔ اور اگر یہ امر فرض بھی کر لیا جاوے تو یہ دھنگ اُسی وقت تک چل سکتا ہے جب تک آدمی اُس سے آگاہ نہ ہو اور جب آدمی نے اُسے اپنی ہوشیاری سے دریافت کر لیا تو پھر وہ کس کا رہا۔ بلکہ اس وقت (نعوذ باللہ) خدا کی طرف نہ فقط بیرحمی بلکہ جہل بھی منسوب ہو سکتا ہے +

پس اس صورت میں کیا آدمی کی قصوروار ی کے بچانے کے واسطے خدا کی غیر محدود پروردگاری سے انکار کریں؟ نہیں ہرگز نہیں ورنہ دینداری بالکل جاتی رہیگی +

خدا کی خالقی اور اُس کی پروردگاری میں بڑا فرق ہے۔ اگرچہ خدا ان دونوں سے اس دنیا میں کام کرتا ہے اور اُس کے بعضے کاموں میں (مثلاً معجزوں میں) خالقی زیادہ معلوم ہوتی ہے اور بعضے کاموں میں پروردگاری۔ پھر بھی جب اُس نے دنیا کو پہلے پہل پیدا کیا تو محض خالقی کو کام فرمایا اور اُس کے بعد پھر محض خالقی عمل میں نہیں آئی۔ اگر خدا نے آدمی کو گنہگار مخلوق کیا ہوتا (نعوذ باللہ) بیشک وہ گناہ کا بانی ہوتا لیکن گنہگار آدمی کی پرورش کرنے یعنی اُن قوتوں کے برقرار رکھنے سے جو اُس نے اُس کو دی ہیں وہ آدمی کے گناہ کا بانی نہیں ٹھیرتا +

فی الحقیقت خدا کی پروردگاری اُس کی ایک یکساں تاثیر ہے جس سے ساری مخلوقات ہر دم سنبھلی اور اُس کے ماتحت محفوظ رہتی ہے۔ وہ سب کے سارے کاموں کی بنیاد ہے لیکن اُن کو ذرا بھی ادھر اُدھر ڈال

نہیں کرتی۔ اُس سے ایسا بندوبست ہوتا ہے کہ آدمی کے کاموں کے نتیجے خدا کی مشیت کی حدوں سے تجاوز نہیں کرنے پاتے بلکہ خدا کی مشیت ہی پوری ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ ناطق و غیر ناطق بھلوں اور بُروں سے بالکل برابر علاقہ رکھتی ہے لیکن کسی شخص کو کچھ رغبت نہیں دلاتی۔ پس آدمی کی قصورواری اور جوابدہی میں خواہ مزاج کے سبب ہو خواہ قصد خواہ فعل کے سبب خدا کی پروردگاری سے کسی طرح فرق نہیں آتا ہر دم آدمی کو کام اور ارادہ اور خواہش کرنے کی قوت خدا سے ملتی ہے۔ لیکن وہ بُرا کام یا ارادہ یا خواہش آپ ہی سے کرتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ خدا بُرا کام یا ارادہ کرنے کے وقت کرنے والے کو کیوں سنبھالتا ہے تو اس سوال کے یہ معنے ہوئے کہ خدا کرنیوالے کو کیوں نیست نہیں کر دیتا کیونکہ اُس شخصیت میں جو مخلوق ہے گناہ کا امکان شامل ہے۔

اس بات میں البتہ بائبل کے اندر ایسی آیتیں ہیں جن کا مطلب سمجھنا مشکل ہے مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ تمام بائبل کے پڑھنے سے یہ یقین ہوتا ہے کہ اُس میں یہی عقیدہ ہے کہ خدا کسی طرح گناہ کا بانی نہیں ہے بلکہ اُس سے نہایت نفرت رکھتا ہے اور اسی سبب سے قہار ہے۔ کفارے کے عقیدہ پر کچھ ہی اعتراض ہو مگر اُس کی بنیاد یہی ہے کہ گناہ کی مغفرت نہایت ہی مشکل ہے۔ رومیوں کے خط ۸: ۷ اور کلسیوں کے خط کے ۱: ۲۱ میں گناہ کی حالت خدا کی دشمنی کہلاتی ہے۔ یوحنا کے پہلے خط کے ۱: ۵ میں لکھا ہے کہ خدا میں تاریکی ذرا بھی نہیں ہے۔ یعقوب کے خط کے ۱: ۱۳ میں مذکور ہے کہ وہ بُرائی کے واسطے کسی کو نہیں آزماتا اور اسی باب کی ۱۷۔ آیت میں جو لکھا ہے کہ "ہر طرح کا اچھا انعام .... اوپر سے ملتا ہے" قرینہ سے اُس کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ اوپر سے صرف اچھے ہی انعام ملتے ہیں۔ ابلیس کی نسبت جو یہ عقیدہ ہے

کہ وہ بدی[1] کا بانی ہے اور خدا کے بالکل برخلاف ہے اس سے بھی صاف ظاہر ہے کہ خدا بدی کا بانی نہیں ہو سکتا ۔

جو آیتیں اس کے برخلاف معلوم ہوتی ہیں وہ عہدنامہ عتیق میں ہیں۔ اُس کے ظہور کے وقت جب آدمی کی شخصیت کی بزرگی خدا کے مجسم ہونے سے بالکل ظاہر نہ کی گئی تھی خدا کی قدرت مطلق اور ہر جگہ تاثیر کرنی دینداروں کے دلوں پر ایسی غالب آئی تھی کہ یہ بخوبی ظاہر نہیں ہوا تھا کہ بدی اُس تاثیر سے بالکل الگ ہے۔ اس واسطے سموئیل کی دوسری کتاب کے ۲۴: ۱ میں لکھا ہے کہ خدا نے بنی اسرائیل پر غصہ ہو کر داؤد کو اُن کی مردم شماری کے لئے ترغیب دی۔ اس طرح کی اَور بھی آیتیں ہیں لیکن اِن سے آسان تر ہیں مثلاً سموئیل کی دوسری کتاب کے ۱۶: ۱۰- اور ۱۱- سلاطین کی پہلی کتاب کے ۲۲: ۲۲ یشعیاہ کے ۶۳: ۱۷ یشعیاہ کے ۴۵: ۷- اور عاموس کے ۳: ۶ میں بُرائی سے مراد ظاہری نقصان ہے۔ پیدائش کے ۴۵: ۸ کی تفسیر پیدائش کے ۵۰: ۲۰ میں ہے یعنے یہ کہ تم نے تو میرے لئے بُرائی کا خیال کیا لیکن خدا نے اسی بات کو بھلائی کے لئے خیال کیا۔ جن گناہوں کی طرف بائبل میں خاص اشارہ ہے۔ مثلاً آدم اور حوا کی نافرمانی۔ قائن کی برادرکشی۔ طوفان کے وقت کی خرابی سدوم اور عمورا کی شرارت۔ داؤد کا خون اور زنا کرنا۔ بنی اسرائیل اور یہودا اور اُن کے بادشاہوں کا پُشت در پُشت زیادہ بُرا ہونا وغیرہ اُن کے ذکر کتاب کے بیان میں خدا کا نام کبھی نہیں آتا ۔

مسیحی دین کے خاص اِن دو عقیدوں یعنے عدالت اور نجات کے عقیدوں سے یہ ثابت ہے کہ گناہ کی قصورداری مطلق خدا پر نہیں ہے ۔

[1] یوحنا کے ۹: ۲-۳ کو دیکھو ۔

۱- اِس زندگی میں دینداروں کے اندرونی اور بیرونی حال میں بڑا فرق ہے یعنے اُن کے دل تو خدا کی محبت سے آراستہ ہیں اور ظاہری حال دنیا کی تکلیفوں سے پریشان - لیکن چاہئے کہ بیرونی حال اندرونی حال کے مطابق ہو - اور یہی وہ کمال ہے جس کا عاقبت میں وعدہ کیا گیا ہے - اس کمال کے لئے یہ ضرور ہے کہ خدا کے بندوں اور اُس کے دشمنوں کی وہ رفاقت جو اس دنیا میں خواہ مخواہ ہوتی ہے بالکل اور ہمیشہ کے لئے بند ہو - آدمیوں کے باہم جو رشتے ہیں وہ اُسی حال میں دائم رہ سکتے ہیں جبکہ وہ رشتے خدا کے رشتہ میں شامل اور اُس کے تابعدار ہو گئے ہوں اور جس صورت میں ایک رشتہ دار خدا کا تابعدار ہو اور دوسرا اُس سے سرکش ہو تو اُن کا رشتہ ضرور منقطع ہو جائیگا - چنانچہ بہت زبانوں میں عدالت کے اصل معنی جدا جدا کرنا ہیں - مثلاً ہندی میں اُس کو بچار کہتے ہیں - بعضے لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ لڑکوں کا خیال ہے کہ سب آدمی مطلق نیک یا مطلق بد کھلائیں کیونکہ ہر ایک انسان میں نیکی اور بدی ملی ہوئی ہے - لیکن بعضے وقت لڑکوں کی سادگی سے ایسی عمیق باتوں کی حقیقت پہچانی جاتی ہے جو بالغ اور عقلمندوں کو نہیں صرف اسی دنیا کا زیادہ تجربہ ہے نظر نہیں آتی ہیں - یہ تو سچ ہے کہ زندگی میں نیکی اور بدی ہر انسان میں ملی ہوئی ہے اور ہم کسی کو مطلق نیک یا مطلق بد نہیں کہہ سکتے لیکن کیا اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ اُن کا ہمیشہ ملا رہنا ضرور ہے اور خدا ہم سے زیادہ ہر انسان کی حقیقی طبیعت نہیں جانتا اگر نیکی اور بدی کی ماہیتیں بالکل جدا جدا نہیں ہیں تو ہمارا سارا بیان عبث ہے اور نیز اگر ایسی ہی ہیں تو ضرور ہے کہ کسی وقت تو بظاہر ایک دوسرے سے جدا ہوں جیسا کہ اس زندگی میں انسان کی طبیعت یا نیک ہے یا بد یعنے یا وہ خدا کا فرمانبردار ہے یا نہیں - یا ہی ضرور ہے کہ

وہ نیکی یا بدی جو یہاں اُس کے دل میں مرکوز ہے عاقبت میں بھی اُس کے تمام دل پر حاوی ہو کر اُس کی بیرونی حالت میں بھی ظاہر ہو۔ متی ۳: ۱۰ اور ۷: ۱۶ و ۱۷- اور ۱۲: ۳۳ سے ۳۵ تک دیکھو +

اس واسطے خدا کی عدالت میں نہ صرف جدا جدا کرنا بلکہ سزا و جزا بھی شامل ہے اور سزا و جزا یہی ہے کہ کسی کا بیرونی حال اُس کے اندرونی حال کے مطابق کر دیا جائے +

پر بُرائی دو طرح کی ہے شرارت اور بلا- یہ دونو طرح کی بُرائی زندگی اور ترقی کی مزاحم ہے- شرارت زندگی کی وہ مزاحم ہے جو انسان کی خودمختاری سے ہوتی ہے اور بلا وہ مزاحم ہے جو خارج سے انسان پر آتی ہے- لیکن جس طرح بلا کی مزاحمت فوراً معلوم ہو جاتی ہے اُس طرح شرارت کی مزاحمت معلوم نہیں ہوتی- اسی سبب سے سزا ضرور ہوئی کیونکہ سزا سے وہ بُرائی جو خوشی کے ساتھ کی گئی تھی انجام کو اپنی حقیقی صورت پکڑ کر لیتے زندگی کی مزاحم معلوم ہو کر فاعل کی طرف رجوع کرتی ہے- یہ سزا اوّل تو وہ دُکھ ہے جو قصورواری کی واقفیت سے قصوروار کے دل میں پیدا ہوتا ہے- لیکن کیا یہی سزا کافی ہے؟ ہرگز نہیں کیونکہ یہ سزا ہمیشہ گناہ کے برابر نہیں ہوتی بلکہ جتنا زیادہ کوئی گناہ میں پھنسا ہوتا ہے اُتنی ہی یہ سزا کم پاتا ہے- پس اس طرح سے زیادہ گنہگار کم سزا پائیگا اس سبب سے آئندہ کے لئے سزا دینی ضرور ہے جس سے گنہگار کے اندرونی و بیرونی حال کا وہ فرق جس کا قائم رہنا خدا کی نیک حکومت کے برخلاف ہوتا ہمیشہ کے واسطے موقوف ہو جائے اور جیسا کہ اُس کا اندرونی حال خراب ہے ویسا ہی بیرونی حال بھی ہو جائے +

پس جب کہ خدا گناہ پر سزا دینے والا ٹھیرا تو ممکن نہیں کہ وہ کسی صورت سے اُس کا بانی بھی ہو وہ نہ صرف نیک و بدی کی نہیں بلکہ خدا کی بھی

واقعیت میں بڑی ابتری ہوگی - لیکن خدا کی خالق اور آدمی سگناہ کے درمیان جتنے وسیلے ہیں اگر اُن میں سے ایک خود مختاری ہو تو خدا گناہ کا بانی ٹھیرے - پس آدمی خدا کے اختیار میں ہے ورنہ خدا اُسے سزا نہ دے سکتا لیکن پھر آدمی خود مختار بھی ہے اس لئے اُس کو سزا دینی بے انصافی نہیں ؎

پھر سزا اور تنبیہ میں بڑا فرق ہے - ہاں یہ تو صحیح ہے کہ ایک ہی کام یعنے دُکھ دینا ان دونو سے ہو سکتا ہے لیکن مطلب دونو کا جُدا جُدا ہے - تنبیہ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کا فائدہ ہو اور سزا کا منشا یہ ہے کہ شریعت کا حق ادا ہو یعنے یہ ظاہر ہو کہ شریعت کی عدول حکمی سے اُس کی شان میں کچھ فرق نہیں آیا - شریعت زبردستی سے تو اپنی فرمانبرداری نہیں کرا سکتی لیکن نافرمانی کی سزا کے سبب اپنا حق ادا کرا لیتی ہے ؎

یونانی زبان میں جو انجیل ہے اُس میں یہ دو تو مطلب جدا جدا لفظوں سے مذکور ہیں - تنبیہ الٰہی نجات سے متعلق ہے - طیطس کے پہلے خط کے ۲: ۱۱ - اور ۱۲ کو دیکھو - بیبل میں تنبیہ صرف اُن ہی کی نسبت مذکور ہے جو ایمان سے خدا کے تابعدار اور فرزند ہو گئے ہیں اور سزائے الٰہی صرف دنیادار لوگوں کے لئے ہوتی ہے خواہ وہ کبھی ایماندار نہ ہوئے ہوں اور خواہ ایمان سے گر گئے ہوں - یہ خاصکر کرنتھیوں کے پہلے خط کے ۱۱: ۳۰ و ۳۲ سے معلوم ہوتا ہے - اُس میں لکھا ہے کہ " ہم خدا سے تنبیہ پاتے ہیں کہ مبادا ہم پر دُنیا کی طرح سزا کا حکم ہو " اس واسطے بائبل میں ہے کہ تنبیہ الٰہی محبت سے اور سزا کے الٰہی غضب سے ہوتی ہے - یہ تو سچ ہے کہ خدا سب سے محبت کرتا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ ایمانداروں کے لئے تنبیہ الٰہی بھی

لہ پطرس کے خط کے ۲: ۹ و ۲۹ کو دیکھو ؎

Scanned by CamScanner

کرنے والی آگ ہے"۔ مگر ان دونوں کی اصل ایک ہی ہے یعنے محبت خواہ مخواہ اپنی ضد کی مخالفت کرتی ہے اگر خدا گناہ پر غضبناک نہ ہوتا تو اُس کی محبت میں بڑا خلل آتا سزا سے اُس کے پانے والے کی عزت ہوتی ہے۔ اگر حاکم قصوروار کے محض فائدہ کا لحاظ کر کے فتوے دیتا تو وہ قصوروار کی خودمختاری میں خلل ڈالتا یعنے اُس کے ایسے فتوے سے یہ ثابت ہوتا کہ قصوروار نے وہ جُرم ایک کل کی طرح ناچاری کی حالت میں کیا ہے۔ اور اگر خدا گنہگار کو سزا نہ دیتا یعنے اگر صرف اُس کو تنبیہ کرتا تو اُس کی بڑی بے عزتی کرتا اور اپنی صورت یعنے آدمی کی خودمختاری سے گویا انکار کرتا۔ جو اپنی خودمختاری سے خدا کی مخالفت کرتا ہے اُسے وہ سزا دیتا ہے اور جو اپنی خودمختاری سے خدا کے اختیار میں رہنا یا رہنا چاہتا ہے اُسے وہ تنبیہ کرتا ہے تاکہ اُس کی بہتری ہو۔ یوحنا کے ۱۵: ۲۔ اور رومیوں کے خط کے ۵: ۳ و ۴ اور ۲۸ اور عبرانیوں کے خط کے ۱۲: ۱۱ کو دیکھو +

جب لوگ ملکی انتظام میں سزا کو موقوف کرنا چاہتے ہیں تو اُس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ آدمی کی قصورواری میں شک کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں وہ خونی جس نے یہ جان کر خون کیا کہ اس سے میں قتل کا مستوجب ہوں گا اُس منصف سے بہتر ہے جو عذر ڈھونڈ کر اُس کو چھڑاتا ہے کیونکہ وہ تو اپنے قصور کی سزا پانے کو تیار ہے مگر یہ اپنے مقدور بھر شریعت ہی کی شان کو مٹاتا ہے +

۴۔ نجات کا عقیدہ بھی اگر ہم گناہ کی قصورواری کو نہ مانیں تو بے معنی ہوگا یہ تو سچ ہے کہ اگر گناہ میں قصورواری نہ ہوتی یعنے اگر خدا نے کسی سبب سے گناہ کو مقرر کیا ہوتا تو بھی وہ آدمیوں کو اُس سے رہائی دے سکتا۔ لیکن ایسی رہائی اور مسیحی دین کی نجات میں بڑا فرق ہے۔ نجات بائبل میں خدا کے فضل ہی کا ایک کام مذکور ہے۔ لیکن اگر گناہ خدا کی جانب سے

ہوتا تو کچھ بھی نہیں کہ اُس کا فضل اُس سے رہائی دینے سے ظاہر ہوتا بلکہ اُس کا کچھ انصاف بھی ظاہر ہوتا - اگر ہمارا گناہ کسی قدر بھی ہمارے سبب سے ہوتا تو ہمارے ساتھ انصاف کیا ہوتا - اور جہاں انصاف کی جگہ نہیں وہاں فضل کی بھی کچھ گنجائش نہیں ہے - پس خدا کا اختیار کلی باقی رہا پھر اگر گناہ میں قصور واری نہ ہوتی تو گناہوں کی مغفرت کس طرح ہو سکتی - کیونکہ گناہ کی مغفرت سے یہ مطلب نہیں ہے کہ خدا فی الحقیقت ہم کو بےقصور ٹھیراتا ہے - بلکہ وہ ہمیں قصوروار ٹھیرا کر اپنے فضل سے کہتا ہے کہ باوجود قصورواری کے میں قصوروار کو اپنی مقاربت سے خارج نہ کرونگا - اگر گناہ خدا کی طرف سے مقرر ہوتا تو خدا نے اُس کی مغفرت چاہنی نہ صرف بیوقوفی بلکہ سرکشی بھی ہوتی +

لیکن خاصکر مسیح کے کفارہ سے گناہ کی قصورواری ثابت ہے - جو لوگ سمجھتے ہیں کہ فقط زمانہ حال کا گناہ آدمی کو خدا سے الگ کرتا ہے اور اُس گناہ کو چھوڑ کر خدا کی طرف رجوع کرنی مغفرت کے لئے کافی ہے - وہ دو طرح سے غلطی میں پڑے ہوئے ہیں ایک تو یہ کہ جو شخص گناہ کرتا ہے وہ گناہ کا غلام ہو جاتا ہے اور آدمی اپنے تئیں اُس کی غلامی میں تو دے سکتا ہے مگر پھر اُسے اپنے تئیں چھڑا نہیں سکتا - دوسرے یہ کہ اگر بالفرض کوئی گناہ کے بند سے خود بخود چھوٹ بھی جائے تو بھی گناہ کی قصورواری رہجاتی ہے - جو گناہ ہو چکا وہ اگرچہ ازروئے واقعہ گذر چکا مگر قصورواری کے لحاظ سے جب تک اُس کا کفارہ نہو لے موجود رہتا ہے - اس واسطے اُس مقام میں جہاں نجات کے عقیدہ کا سب سے زیادہ صاف بیان ہوا یعنے رومیوں کے خط کے ۳: ۲۴ اور ۲۵ اور ۲۶ میں گذشتہ گناہوں کا خاص ذکر ہے کہ اُن ہی کے واسطے مسیح کا کفارہ ضرور تھا اور اُس تحمل کے سبب جو خدا نے اُن سے کیا تھا اُن کا کفارہ دینا خدا کے انصاف کے ظہور کے واسطے

لا بد تھا۔ اور کفارہ فقط مسیح ہی سے ہو سکا ایک تو اس واسطے کہ وہی اکیلا بیگناہ تھا اور دوسرے اس لئے کہ خدا کا بیٹا ہو کر وہ تمام آدمیوں سے ایسا علاقہ رکھتا تھا کہ جس کے سبب وہ اپنی محبت کے زور سے اُن کے ساتھ شامل ہو کر اُن کی سزا اُٹھا سکا۔ اس سبب سے خدا کی ساری سزاؤں کی نسبت مسیح کا مصلوب ہونا زیادہ تر گناہ کی حقیقی قصوروار ی کو ثابت کرتا ہے۔

اس لئے اس کفارہ سے پہلے خدا اور انسان کے درمیان اُس جدائی کا وقوع جو عہد نامۂ عتیق سے ظاہر ہے ضرور تھا۔ غیر مذہبوں کا یہ خاص نقص ہے کہ اُن میں اس جدائی کا کم لحاظ ہوتا ہے اور اگرچہ کفارہ نہیں ہوتا پھر بھی آدمی خدا کی عبادت بے پروائی سے کرنے کو راغب ہوتا ہے۔ برعکس اس کے بنی اسرائیل میں اگرچہ خدا کے عہد سے۔ قربانیوں سے۔ عبادت کے ٹھہرائے ہوئے سامان سے۔ مسیح کی اُمید سے۔ اور اَور سببوں سے یہ جدائی کی واقعیت کچھ کچھ دور ہوتی تھی۔ مگر پھر بھی ان سببوں کی ناتمامی کی وجہ سے دیندار لوگ اپنے تئیں خدا سے جُدا جانتے تھے +

تیسرا حصّہ کیا گناہ ضروری ہے

چھٹا باب

آدمی کی ناتمامی

اب تک ہم نے اپنے ہی دل کی گواہی سُن کر اور اپنے تجربہ کی طرف توجہ کر کے گناہ کا حال دریافت کیا اور دیکھا کہ بائبل کا مضمون بھی اُس کے مطابق ہے اور بیشک ہم اپنے تجربہ ہی سے گناہ کو معلوم کرتے ہیں۔ لیکن ہماری عقل

خواہ مخواہ یہ سوال کرنا چاہتی ہے کہ گناہ کس طرح سے ہوا۔ جب خدا نے اپنی پاک مرضی اور قدرت مطلق سے دُنیا کو پیدا کیا تو ایسی دنیا میں اُس کی ایسی دشمنی کہ جس کے بدلے میں آدمی کو ابدی سزا مل سکتی ہے اور جس کے کفارہ میں خدا کے بیٹے کو بے انتہا دکھوں کے ساتھ مرنا ہوا کس طرح سے ہے؟ اِس سوال کے جواب دو قسم کے ہو سکتے ہیں۔ ایک قسم کے جوابوں کا تو خلاصہ یہ ہے کہ گناہ کسی نہ کسی طرح کی ضرورت کے سبب ہوا دوسری قسم کا ایک ہی جواب ہے یعنے یہ کہ گناہ آدمی کی خود مختاری سے ہوا پیشتر ہم کو پہلی قسم کی رایوں کو رد کرنا ضرور ہے پھر اُس کے بعد ہم دوسری قسم کی رائے کو بیان کرینگے +

اُن راؤں میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی کی ناتمامی کے سبب گناہ کا ہونا ضرور تھا۔ خدا ہی کی ذات کامل ہے اور مخلوق ناتمام ہے۔ اور اس ناتمامی کے سبب جس طرح اُس کے سُکھ کے ساتھ دُکھ اور اُس کے علم کے ساتھ غلطی ملی ہوئی ہے اُسی طرح نیکی کے ساتھ بدی بھی ملی رہتی کچھ تعجب کی بات نہیں ہے یعنے جیسے کہ تاریکی۔ سردی۔ غلطی کی ہستی نہیں ہے بلکہ یہ صرف نفی کی صورتیں ہیں اسی طرح بدی کی بھی ہستی نہیں اور چونکہ نفی کا کوئی بانی نہیں ہو سکتا اس لئے خدا گناہ کا بانی نہیں ٹھیرتا +

اس رائے کا پہلا جواب یہ ہے کہ اگر گناہ مخلوق کی ناتمامی کا ضرور نتیجہ ہے تو جو لوگ یہ مانتے ہیں کہ آدمی غیر فانی ہے اُن کو یہ بھی ماننا چاہیے کہ گناہ غیر فانی ہے۔ اگرچہ وہ رفتہ رفتہ ابد تک کم ہوتا جاتا ہے پھر بھی چونکہ آدمی ابد تک مخلوق ہی رہیگا اس واسطے اُس کو ابد تک گنہگار بھی رہنا ہوگا +

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر سب گناہ کمزوری کے سبب ہوتے تو شاید رائے مذکور صحیح ٹھیر سکتی۔ لیکن بدخواہی اور بدی کی بے شرم سیری

اور نیکی اور نیکوں کی دشمنی کس طرح اُس حال میں ہو سکتی۔ اور اگر گناہ نفی ہے تو کس طرح اُس میں ترقی ہو سکتی ہے؟ کس طرح ایک گناہ سے اور بہت سے گناہ پیدا ہو سکتے ہیں؟ کس طرح گناہ سے دل سخت ہو سکتا ہے؟

تیسرا جواب یہ ہے کہ جب گناہ کسی پر یہاں تک غالب آتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر خود غرضی کرتا ہے تو اُس کی عقل اکثر کمزور نہیں ہوتی اور نہ وہ سُست ہو جاتا ہے بلکہ بڑی عقلمندی اور چالاکی کے ساتھ اپنی خواہشیں پوری کرتا ہے۔ تسلنیکیوں کے دوسرے خط کے ۲: ۱۱ میں آدمی کی کامل خرابی "دغا کی تاثیر" کہلاتی ہے اور جیسا کرنتھیوں کے پہلے خط کے ۲: ۱۰ میں خدا کی عمیق باتیں مذکور ہیں ویسا ہی مکاشفہ کے ۲: ۲۴ میں شیطان کی عمیق باتیں بھی مذکور ہیں۔ اور مسیح کہتا[1] ہے کہ اِس دنیا کے فرزند نور کے فرزندوں سے زیادہ ہوشیار ہیں۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ اگر گناہ نفی اور کمزوری کا نتیجہ ہوتا تو ہم اُس سے نفرت نہ کر سکتے بلکہ گنہگار پر شفقت کرتے۔ یہ تو سچ ہے کہ جتنی زیادہ یہ رائے پھیلے گی اُتنی ہی کم گناہ سے نفرت ہوگی۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ گناہ کی تاثیر کے سبب سب لوگ گناہ سے بہت ہی تھوڑی سی نفرت کرتے ہیں۔ لیکن جب دستور کے خلاف کوئی بہت بڑی بدی نظر آتی ہے تو خواہ مخواہ نفرت ہوتی ہے بلکہ اس رائے کے پیرو بھی اُس سے نفرت کرتے ہیں۔

پانچواں جواب یہ ہے کہ یہ رائے بائبل کے بالکل برخلاف ہے۔ اُس میں خدا کی شفقت اور رحمت جو گنہگاروں پر ہوتی ہے اُس کا کثرت سے ذکر تو ہے مگر پھر بھی گناہ کو خدا کے غضب کا سبب اور گنہگار کو خدا کا دشمن اور شیطان کا ساتھی اور عذاب کا مستوجب لکھا ہے۔ مسیح بھی اہلِ یروشلیم کی حالت پر رویا تھا لیکن اُس کے اکثر کلام سے یہ ثابت ہے

[1] لوقا کے ۱۶: ۸ کو دیکھو۔

https://www.rekhta.org/ebool
Haqiqat-e-Gunah

کہ وہ گناہ سے نہایت نفرت کرتا تھا اور اُس پر بڑا غضبناک ہوتا تھا۔ اور تمام بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا چاہتا ہے کہ ہم گناہ پر نہ صرف افسوس کریں بلکہ جانفشانی کے ساتھ اُس کی مخالفت بھی کریں اور جب تک وہ کچھ بھی باقی رہے آرام نہ کریں پھر اُس میں دجّال کی نسبت پیشین گوئی ہے کہ آخر میں بدی نہایت زور پکڑے گی یہ سب باتیں اس رائے کے بالکل برخلاف ہیں کہ گناہ نفی ہے۔ مسیحی دین کے اندر نیکی اور بدی میں آسمان و زمین کا فرق ہے نہ کہ درجوں ہی کا یعنے یہ نہیں ہے کہ بدی صرف کم اچھی نیکی ہو +

اس تمام غلطی کا ایک یہ سبب ہے کہ نیکی اور بدی کے دو معنوں کو ملا دیا ہے۔ ہستی ایک طرح کی نیکی ہے اور جتنی وہ کامل یعنے نیستی سے دور ہے اُتنی ہی وہ زیادہ ایک طرح سے نیک ہے۔ لیکن یہ نیکی اور بدی شخصوں کے خود مختاری کے کاموں سے اور نیز اُن کی شریعت سے کچھ علاقہ نہیں رکھتی۔ ایک طرح سے تو شیطان بھی نیک ہے کیونکہ اُس میں بھی ہستی ہے مگر دوسری طرح سے وہ بالکل بد ہے +

البتہ ایک طرح سے گناہ بھی نفی کہلا سکتا ہے یعنے آدمی کو جیسا ہونا چاہئے اور جو اُس کی پیدائش سے مقصد ہے اُس کا ویسا نہ ہونا گناہ ہے۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ اس نفی کا سبب کیا ہے؟ اگر کہو کہ اس کا سبب وہ نفی ہے جو اوپر مذکور ہوئی یعنی نیکی کا عدم تو یہ صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ نفی جو آدمی کی ذات کے برخلاف ہے اُس نفی سے جو اُس کی ذات میں شامل ہے پیدا نہیں ہو سکتی +

یہ رائے ہیگل اور نو افلاطونی فیلسوفوں کی ہے اور کلیسیا کے بعض معلّموں کی کتابوں میں بھی پائی جاتی ہے لیکن اگلی کلیسیا میں بادی النظر میں اُس کا خاص طرفدار آگسٹین معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ آگسٹین کو مانیخائیوں کی مخالفت کرنی پڑی جو گناہ کو ایک حقیقت سمجھتے تھے اس واسطے

Scanned by CamScanner

اُس نے اُس کو کوئی شے نہیں بلکہ نیکی کی نفی کہا۔ لیکن جب زیادہ غور سے اُس کے نوشتوں کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا مطلب یہ تھا کہ بدی بھی اور کمال کی روکنے والی اور برباد کرنے والی ہے جیسا کہ آگ لکڑی کی فنا کرنے والی ہے۔ اس مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ اوگسٹین گناہ کو خدا کی مخالفت جو مخلوق ہی کی طرف سے ہوتی ہے سمجھتا تھا +

ساتواں باب

آدمی کی جسمانیت

اب یہ بات ثابت ہوئی کہ گناہ نفی نہیں ہے۔ گو وہ آدمی کی پیدائش کے مقصد کے برخلاف ہے پھر بھی اس مخالفت کا کوئی مثبتی سبب ہونا چاہئے۔ مگر جب یہ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا ہے تو بہت سے لوگ یہ جواب دیتے ہیں کہ وہ جسم ہے۔ اور چونکہ آدمی نہ صرف روحانی بلکہ جسمانی بھی ہے تو کچھ تعجب نہیں کہ وہ گنہگار ہے۔ یہ رائے اُس پہلی رائے سے کچھ بہتر ہے اس واسطے کہ اُس کو مانکر ہم گناہ کی مخالفت تو کر سکتے ہیں +

لیکن اس رائے کا مطلب کیا ہے؟ کیا یہ ہے کہ فی الحقیقت جسم بد ہے؟ مگر یہ تو کوئی نہیں سمجھتا کہ حیوانات کا بھی جسم بد ہے۔ تو کیا یہ مطلب ہے کہ جو جسم روح کے ساتھ مقید ہے وہ اُس روح کے واسطے گناہ کا باعث ہے یعنے جسم آپ تو گناہ نہیں کرتا مگر روح اُس کی تابعدار ہو کر گنہگار ہوتی ہے۔ لیکن اسکا کیا سبب ہو سکتا ہے کہ جو شے بالذات اعلیٰ اور حاکم ہے وہ اپنے سے بالذات ادنیٰ اور محکوم کی تابعدار ہوتی ہے۔ شاید کوئی یہ جواب دے کہ جسم تو آرام چاہتا ہے اور روح حق چاہتی ہے اور حق اکثر تلخ معلوم ہوتا ہے۔ اس بات سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ روح اور جسم کے درمیان اکثر مخالفت

رہتی ہے بلکہ کبھی کبھی جسم رُوح پر غالب بھی آ جاتا ہے لیکن یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کیونکر رُوح جسم سے اِس قدر مغلوب ہو سکتی ہے کہ صرف جسمانی آرام کے حاصل کرنے کے کام آنے اور یہ حال برابر بلکہ تادمِ مرگ رہے جیسا اکثر آدمیوں میں دیکھا جاتا ہے۔ اگر اس کا جواب یہ ہو کہ آدمی اپنی خود مختاری سے رُوح کی نہیں سُنتا بلکہ جسم ہی کی سُنتا ہے تو پھر جسم گناہ کا باعث نہیں رہا کیونکہ یہ تو سب پر روشن ہے کہ جسم شریعت کی مخالفت کرتا ہے اور اکثر گناہ اسی سے ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں ہم اِس بات کا ذکر نہیں کرتے کہ گناہ کی حقیقت کیا ہے بلکہ صرف اسی کا ذکر کرتے ہیں کہ اُس کا سبب کیا ہے۔ تعجب انگیز اور نہایت مشکل بات یہی ہے کہ جب آدمی کی شرع دانی اور خود مختاری دونو اُس کی رُوح میں شامل ہیں تو رُوح اپنی شریعت کی دشمن کر بے ضرورت ایک ادنیٰ چیز کی غلامی کیوں اختیار کرتی ہے۔ اگر یہ کہیں کہ وہ اپنی بدی ہی سے ایسا کرتی ہے تو پھر گناہ کی اصل جسم میں نہیں بلکہ رُوح ہی میں ہے۔ اور اگر یہ کہیں کہ وہ اپنی کمزوری سے ایسا کرتی ہے تو پھر گناہ آدمی کا کام نہیں صرف اُس کی ناچاری ہے اور اس سے اُس کی قصوروار ہی نہیں رہتی ✤

لیکن شاید اس رائے کا مطلب یہ ہو کہ جسم ہر شخص میں رُوح سے بہت پہلے ترقی کرتا ہے اور زور پکڑتا ہے اور جب تک رُوح جاگے اور اپنی شریعت سے واقف ہو اُس وقت تک جسم اتنا زور پکڑ لیتا ہے۔ کہ رُوح کا اُس پر غالب ہونا نہایت ہی مشکل ہوتا ہے ✤

رُوح جسم سے بالکل علیحدہ شے ہے۔ ہاں اس میں تو شک نہیں کہ اِن دونو کا ایسا اتفاق ہونا چاہئے کہ جو یہاں نفسانی بدن ہے وہ قیامت کے دن رُوحانی بدن ہو جائے جیسا کہ تھسلنیکیوں کے پہلے خط کے ۵ باب میں مفصل بیان ہوا ہے یعنے بالکل رُوح کے لائق آلہ بلکہ اُس کا

منظر ہو۔ خدا نے رُوح اور بدن میں ایسا علاقہ نہیں رکھا جیسا پرند اور پنجرے
میں ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں دو علیحدہ علیحدہ ہیں۔ رُوح ہی خدا کو
پہچان سکتی ہے۔ رُوح ہی کے سبب ہم اُس[۱] کی نسل ہیں۔ اور جب رُوح
اور جسم کا فرق آدمی کے خیال سے مٹ گیا تو اُس کا جسم روحانی نہیں ہوا
بلکہ رُوح جسمانی ہو گئی ÷

اسی سبب سے جب کسی کی رُوح جاگ کر اپنی شریعت اور اُس علاقہ
سے جو اُس کو خدا کے ساتھ ہے واقف ہو تو چاہئے کہ وہ اُسی وقت
سے جسم کو مغلوب کر کے اُسے اپنا تابعدار بنا لے۔ یہ تو صحیح ہے کہ بچہ پہلے
اپنے جسم کی پیروی کرتا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ پہلے اُس کا جسم رُوح
کی مخالفت کرتا ہے۔ پھر اکثر یہ جاگ اُٹھنا آہستہ آہستہ نہیں بلکہ یکبارگی
ہوتا ہے یکبارگی ہی بچہ پہلے اس بات سے واقف ہوتا ہے کہ جو آگے
ماں باپ وغیرہ کی مرضی معلوم ہوتی تھی وہ خدا کی مرضی ہے اور کلیتہً
مجھ پر فرض ہے ÷

پھر اگر ہم فرض کریں کہ گناہ جسم کے پہلے ہی ترقی پانے کے سبب
سے ہوتا ہے تو تین نتیجوں میں سے ایک نہ ایک ضرور پیدا ہوگا۔ اگر
رُوح کی ترقی شروع ہونے کے وقت سے دونو کی ترقی برابر
تیزی سے مانی جائے تو نیکی کبھی آدمی سے نہ ہو سکے گی۔ اور اگر اُس
وقت سے جسم کی تاثیر جوں کی توں رہے تو جسم زندہ نہ رہ سکے گا۔ اور
اگر اُس وقت کے رُوح کی ترقی زیادہ تیزی سے ہو اور جسم کی تاثیر
کی ترقی آہستہ آہستہ تو کسی نہ کسی وقت دونو برابر ہو جائینگی اور اُس
وقت سے پہلے تو آدمی خواہ مخواہ گنہگار رہیگا اور بعد خواہ مخواہ نیک

[۱] اعمال ۱۷: ۲۸ کو دیکھو

یعنی لڑکپن میں زیادہ گناہ ہوگا جو سب کے تجربہ اور متی کے ۱۹: ۱۴-۱
کرنتھیوں کے پہلے خط کے ۱۴: ۲۰ کے صاف برخلاف ہے اور پھر جتنا
کوئی علم اور باقی روحانی صفتوں میں ترقی کرے اتنا ہی کم گنہگار ہوگا
لیکن اس کے برعکس ایسے ہی لوگوں میں سب سے بڑے گنہگار ملتے ہیں
علم سے گناہ گھٹتا مطلق نہیں صرف چھپتا ہے۔ بلکہ اگر علم کے ساتھ تاثیر
الٰہی نہ ہو تو اس سے آدمی کے دل میں گناہ کا اختیار زیادہ ہی قرار پکڑتا ہے

ابتک ہم نے یہ فرض کیا ہے کہ گناہ جسم ہی کے اختیار پانے سے
ہوتا ہے۔ لیکن کیا یہ صحیح ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ بلکہ بہت لوگوں نے
روحانی خودغرضی کے واسطے اپنی جسمانی خواہشوں کو خوب مارا اور دبا رکھا ہے
مثلاً کتنوں ہی نے صرف اسی واسطے کہ ہمارے پیچھے ہمارا بڑا نام دنیا میں رہے
بڑی حکمت اور چالاکی اور ہوشیاری کے ساتھ خوب عزم کر کر کے اپنی حکومت
پھیلائی۔ کیا ہم اس کو جسم کا روح پر غالب آنا کہہ سکتے ہیں؟ اور اگر
نہیں تو کیا یہ برا نہیں؟ بے شک روح کی برائی جب تک کہ خدا کی
تابعداری نہ کرے بدی کی برائی ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جسم گناہ
کا سبب ہے وہ صرف موٹے موٹے گناہوں کا ذکر کر کے۔ غرور۔ حسد۔
دنیاوی اختیار کی خواہش وغیرہ روحانی گناہوں کا ذکر چھوڑ دیتے ہیں
وہ گناہ کو صرف آدمی کی مجبوری و پست حالی سمجھتے ہیں لیکن فی الحقیقت
گناہ اس کی جھوٹی عظمت بھی ہے۔ وہ گناہ کو صرف روحانی قوت کی
کمی سمجھتے ہیں لیکن فی الحقیقت وہ اس کی زیادتی بھی ہے۔ اس میں
شک نہیں کہ روحانی گناہ اسی سبب سے کہ وہ جسمانی گناہوں سے
زیادہ پوشیدہ ہیں ان سے زیادہ مہلک بھی ہیں چنانچہ آدم و حوا کے
پہلے گناہ کے بیان سے۔ بنی اسرائیل کی تواریخ سے۔ اور مسیح کی زندگی
کے احوال سے یہ امر ظاہر ہوتا ہے۔ مسیح نے فریسیوں سے کہا کہ خراج گیر

لہ متی ۲۱: ۳۱ کو دیکھو

اور کسبیاں تم سے پہلے خدا کی بادشاہت میں داخل ہوتی ہیں۔
لیکن اس رائے سے سب سے زیادہ یہ نقصان ہوتا ہے کہ اسکے سبب قصوروار ی کی واقفیت بہت کم ہوتی ہے۔ آدمی خواہ مخواہ اپنے تئیں گنہگار جانتا ہے لیکن جب وہ اپنے گناہ کا سبب اپنے جسم کو بنا سکتا ہے تو آپ معذور ہو جاتا ہے کیونکہ گناہ کا چشمہ وہ نہیں بلکہ ایک غیر شے ہے۔ اُس کے نزدیک دل اپنے آپ تو ہمیشہ پُر نور ہے مگر صرف جسم کے سبب اُس کی تجلی رُکتی ہے۔ بیچارہ دل ایسا کمزور ہے کہ گناہ کرتا تو نہیں لیکن سہتا ہے اور اس کا سبب وہ علاقہ ہے جو رُوح اور جسم کے بیچ میں ہے۔
لیکن اس کے برعکس مسیح فرماتا ہے کہ گناہ[1] دل ہی سے پیدا ہوتا ہے اور اسی طرح آدمی کو ناپاک کرتا ہے۔ اس آیت پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ جب بُرے خیال وغیرہ ناپاک دل سے پیدا ہوتے ہیں تو مسیح کس طرح یہ فرماتا ہے کہ وہ آدمی کو ناپاک کرتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مسیح یہ نہیں کہتا کہ وہ دل کو ناپاک کرتے ہیں بلکہ یہ کہتا ہے کہ کہ اُن سے آدمی ناپاک ہوتا ہے یعنے پہلے اُس کی خود دانی۔ اور پھر اُس کی گفتار اور رفتار ناپاک ہوتی ہے۔ بدن بھی گناہ سے ناپاک ہوتا ہے جیسا کرنتھیوں کے پہلے خط کے ۶: ۱۲ سے ۲۰ تک لکھا ہے۔ اسی واسطے کرنتھیوں کے دوسرے خط کے ۷: ۱۔ میں لکھا ہے کہ جسم اور رُوح کی ساری نجاست سے اپنے تئیں صاف کرو۔
پس جب کہ رُوح اپنے تئیں معذور ٹھیراتی ہے تو گویا بیچارہ جسم کو جس کا کچھ قصور نہیں بلکہ جو رُوح ہی کی تابعداری کرتا ہے اپنے گناہ

[1] متی ۱۵: ۱۹ اور ۲۰ کو دیکھو۔

کا مجرم ٹھیراتی ہے +

اِس رائے سے ایک اور بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ جو گناہ سے بچنا چاہتے ہیں وہ خواہ مخواہ گوشہ نشینی وغیرہ اختیار کر کے اپنے جسم کو ہر طرح سے ناحق ستاتے ہیں اور اس سے اکثر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دشمن قلعہ کے باہر تو مارا جاتا ہے مگر قلعہ کے اندر زیادہ طاقت پاتا ہے۔ یعنے شہوت اور دنیاوی لالچ تو شکست پاتے ہیں مگر اُن کی شکست ہی کے سبب غرور وغیرہ روحانی گناہ بڑھ جاتے ہیں +

اس رائے میں خاص یہی غلطی ہے کہ اس میں جسم کا رُوح پر غلبہ جو گناہ کی ایک بہت ظاہر صورت ہے گناہ کا سبب ٹھیرا اور اس غلبہ کا سبب تلاش نہ کیا گیا۔ اس سبب سے اس رائے کے پیرو گناہ کا بخوبی بیان نہیں کر سکتے۔ گناہ کی اصل حقیقت تو یہ ہے کہ آدمی خداپرستی کے درجہ سے گر کر خود پرست ہو گیا اور اس کے سوا گناہ کے سارے بیان ناقص ہیں۔

لیکن اِن سب دلیلوں کا جواب یہ ہوگا کہ عہد نامۂ جدید کا ظاہرا یہی عقیدہ ہے کہ گناہ آدمی کے جسم سے پیدا ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ مسیح نے خود متی کے ۲۶: ۴۱ اور یوحنا کے ۳: ۶ میں یہ سکھایا اور پولوس بہت جگہ بدن اور اُس کے اعضا کو گناہ کا مسکن کہتا ہے اور خاص کر رومیوں گلتیوں اور کلسیوں کے خطوں میں سارکس کا ایسا بیان کرتا ہے کہ وہ گناہ کا چشمہ ہے اور گنہگار آدمی کو سارکک کہتا ہے اور پاکیزگی حاصل کرنے کی کوشش کو نیوما کی سارکس کے ساتھ لڑائی کہتا ہے +

اور ۲۳ یہ دو یونانی لفظ ہیں جو انجیل میں مستعمل ہیں۔ سارکس کا ترجمہ جسم اور سارکک کا ترجمہ جسمانی یا جسمانی ... سوما اور نیوما کا ترجمہ روحانی ہے لیکن چونکہ ہم یہ نہیں کر سکتے کہ ان لفظوں کے صحیح معنی ہی ہیں یا سوا اسکے ہم انہیں الفاظ کا استعمال کرینگے اور ان کا مفصل بیان اسی باب میں آئیگا۔

لیکن متی کے ۲۶: ۴۱ میں مسیح سب آدمیوں کا ذکر نہیں کرتا بلکہ صرف اپنے شاگردوں کا کرتا ہے وہ اُن کو وفادار اور مستعد تو جانتا تھا لیکن یہ بات ظاہر کرتا تھا کہ ایسے خطرے آئینگے جن میں خاص تمہارے جسم کے وسیلے سے امتحان ہوگا۔ پھر یوحنا کے ۳: ۶ میں پنتوست سے مراد سب آدمیوں کی روح نہیں ہے ورنہ مسیح یہ نہ کہتا کہ وہ رُوح القدس سے پیدا ہوئی کیونکہ قرینہ سے صاف ظاہر ہے کہ وہ کسی ایسی چیز کا ذکر کرتا ہے جو سب آدمیوں سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ تھوڑوں ہی سے رکھتی ہے۔ پس جب پنتوست سے مراد سب آدمیوں کی روح نہیں ہے تو سارک سے بھی مراد سب آدمیوں کا جسم نہوگا +

جب پولوس کے عقیدوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو اولاً اس بات اقرار کرنا ضرور ہوتا ہے کہ پولوس جسمانی گناہوں پر خاص زور دیتا ہے بلکہ بہت جگہ اُن کو سارے گناہوں کی مثال کرکے بیان کرتا ہے مثلاً رومیوں کے خط کے ۶: ۱۲ و ۱۳ و ۱۹۔ اور ۷: ۵ و ۲۳ و ۲۴ میں۔ اور اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ اُس وقت اِس طرح کے گناہوں کا خاص رواج اور بہت کثرت تھی۔ لیکن گناہ کا چشمہ اور گناہ کا وسیلہ یہ دو تو باتیں بالکل جدا جدا ہیں اور انہیں ملانا نہیں چاہئے۔ شک تو اتنا ہی ہے کہ آیا پولوس کے نزدیک گناہ کا سبب یہ ہے کہ جسم یعنے بدن کی حرکتیں وغیرہ رُوح یعنے آدمی کے اَن دیکھے جزو سے مغلوب نہیں ہوتی ہیں بلکہ اُس پر غالب آتی ہیں۔ کیونکہ رومیوں کے خط کے ۸: ۷ و ۸۔ اور گلتیوں کے خط کے ۵: ۱۶ و ۱۷۔ اور افسیوں کے خط کے ۲: ۳۔ اور اور آیتوں سے صاف ظاہر ہے کہ پولوس سارک کو گناہ کا سبب سمجھتا ہے۔ لیکن اِس کا کچھ ثبوت نہیں ملتا کہ پولوس کے نوشتوں میں سارک سے مراد بدن یا اُس کی حرکتیں ہیں۔ بلکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ یہ نصیحت نہ کرسکتا کہ ہم اپنے بدن اور اعضا خدا کو

سونپ دیں تاکہ وہ اُس کی بندگی کے وسیلے ہوں۔ اور نیز مسیحیوں کے
بدنوں کو اس زندگی میں بھی روح القدس کی ہیکل نہ کہہ سکتا۔ رومیوں
کے خط کے ۶: ۱۳ و ۱۹۔ اور ۱۲: ۱۔ اور کرنتھیوں کے پہلے خط کے ۶: ۱۳
و ۱۵ و ۱۹ و ۲۰ کو دیکھو۔ خیال کرنا چاہئے کہ اِن آیتوں میں وہ نہ صرف
یہ کہتا ہے کہ "بدن خداوند کے واسطے ہے" بلکہ یہ بھی کہتا ہے کہ "خداوند
بدن کے واسطے ہے"۔ پھر قیامت کا عقیدہ خاص پولوس ہی کے نوشتوں
میں مذکور ہے کہ یہی نجات کا مقصد ہے اور اُسی وقت ہم گناہ سے
پوری رہائی پائینگے جب ہمارے بدن جی اُٹھینگے۔ لیکن اگر بدن گناہ کا
چشمہ ہوتا تو یہ کیونکر ہو سکتا۔ پھر پولوس کے عقیدوں میں یہ ایک بڑی بات
ہے کہ مسیح فی الحقیقت آدمی تھا مگر پھر بھی بیگناہ تھا۔ پس اگر گناہ کا چشمہ
بدن ہے تو وہ یا فی الحقیقت آدمی نہ تھا یا بیگناہ نہ تھا۔ اگر کہیں کہ
اپنی اُلوہیت ہی کے سبب وہ ہر وقت گناہ سے بچتا تھا ورنہ مبتلا
ہوتا تو اُس کی حقیقی انسانیت میں خلل آئیگا اور اُس کی بیگناہی اُس کی
انسانیت کے اعتبار سے نہ ٹھیرے گی بلکہ یہ ہوگا کہ گناہ ایک غیر جز کے
جبر سے ظاہر ہونے سے رُک سکتا تھا۔ پھر پولوس کے نزدیک جن روحوں کا
جسم نہیں ہے اُن میں سے بھی بعض شریر ہیں بلکہ آدمیوں سے بھی
بہت زیادہ شریر ہیں ۔

ان سب دلیلوں سے ظاہر ہے کہ سارک سے اَور کچھ مراد ہوگی
نہ کہ صرف بدن۔ یہ نتیجہ پولوس کی بعضی آیتوں کے مطالعہ کرنے سے صاف
معلوم ہوگا۔ گلتیوں کے خط کے ۵: ۱۳ میں اگر سارک سے مراد بدن
ہوتا تو وہ یہ کیونکر کہ "آزادی کو سارک کے لئے فرصت نہ سمجھو" یہ کیونکر
کہہ سکتا کہ "بلکہ محبت سے ایک دوسرے کی خدمت کرو"۔ پھر گلتیوں کے
خط کے ۵: ۱۹ سے ۲۱ تک سارک کے کام جو مذکور ہیں اُن میں نہ صرف

Scanned by CamScanner

زنا وغیرہ جسمانی گناہ۔ بلکہ "دشمنی" سے لیکر "خون" تک جتنے مذکور ہیں اور بدن سے نہیں ہوتے وہ بھی شامل ہیں۔ اگرچہ یہ کام جسمانی خواہشوں سے کم و بیش علاقہ تو رکھتے ہیں مگر پھر بھی اُن کو بدن کے کام کوئی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح کرنتھیوں کے پہلے خط کے ۳: ۱ سے ۴ تک کرنتھی لوگ سارکِک کرکے مذکور ہیں اسی واسطے کہ وہ مسیح کے عوض آدمیوں کے پیرو ہوتے تھے۔ اور گلتیوں کے خط کے ۳: ۳ میں جب پولوس یہ کہتا ہے کہ "تم سارک سے کامل ہوتے ہو" تو اس سے جسمانی خواہشیں مراد نہیں ہیں بلکہ شریعت کے کاموں پر بھروسا کرنا مراد ہے۔ پھر کرنتھیوں کے پہلے خط کے ۱: ۲۶ میں جن کا یہ ذکر ہے کہ سارک کی سوچ سے دانشمند ہیں وہ یونانی فیلسوف[1] نہیں ہیں بلکہ وہ ہیں جو خدا کے فضل کو رد کرکے کسی طرح کے فلسفہ پر بھروسا رکھتے ہیں۔ پھر کلسیوں کے خط کے ۲: ۱۸ میں پولوس نے جن کا یہ بیان کیا کہ "وہ اپنی سارکِک عقل سے پھولے ہوئے ہیں" انہیں کا پھر اسی باب کی ۲۳ آیت میں یہ بھی بیان کرتا ہے کہ "وہ اپنے بدن پر شفقت نہیں کرتے" مگر پھر بھی اُن کے کاموں کا یہی نتیجہ ہے کہ "سارک آسودہ ہوتی ہے" پس یہ دیکھنا چاہئے کہ پولوس اس لفظ کو کس معنی میں استعمال کرتا ہے۔ مگر پہلے یہ دیکھو کہ عبرانی میں باسار[2] کے کیا معنی ہیں۔ بعض جگہ تو اُس کے اصلی معنی گوشت پائے جاتے ہیں اور پھر بعضے مقاموں میں تمام بدن اور خاص کر دل اور نفش[3] اور روح کے برخلاف۔ پھر بہت سے مقاموں میں باسار اور نفش کا فرق مٹ گیا ہے۔

[1] فیلسوف جن کا عقیدہ یہ ہے کہ ہیولیٰ کے سوا اور کوئی شے نہیں ہے +

[2] باسار عبرانی میں بشر ہوگیا ہے اور اس کے اصل معنی گوشت کے ہیں +

[3] نفش عبرانی میں نفس اور نفس ہوگیا ہے اور اسکی اصلی معنی جانداروں کی جان کے ہیں +

Scanned by CamScanner

اور باسار سے مراد تمام جاندار ہیں۔ اور بہت سی جگہ خاصکر انسان سے مراد ہے لیکن ساتھ ہی اس لفظ سے یہ خیال بھی پیدا ہوتا ہے کہ انسان کمزور اور ناپائدار ہے مثلاً ایوب کے ۳۴ : ۱۵۔ اور زبور کے ۷۸ : ۳۹۔ یشعیاہ کے ۴۰ : ۶۔ اور خصوصاً جہاں خدا کی قدرت مطلق کا بھی ذکر ہے۔ مثلاً استثنا کے ۵ : ۲۶ یشعیاہ کے ۳۱ : ۳ یرمیاہ کے ۱۷ : ۵ زبور کے ۵۶ : ۵ میں لیکن ان مقاموں میں سے یہ نہیں نکلتا کہ باسار آدمی کی روح کے برخلاف ہو کر گناہ کی طرف مائل ہے۔ بعضے تو سمجھتے ہیں کہ یہ واعظ کے ۵ : ۶ کے معنی ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جسم بہت گناہوں کا آلہ ہے۔ اور بعض لوگ پیدائش کے ۶ : ۳ کے بھی یہی معنی سمجھتے ہیں لیکن اس سے آدمی کی صرف کمزوری اور ناپائداری ثابت ہوتی ہے۔

اپکرُوفا[1] میں بھی سارک کے وہی معنے ہیں جو عہد نامہ عتیق میں باسار کے ہیں +

عہد نامہ جدید میں بھی سارک کا ویسا ہی استعمال ہے۔ بعض جگہ اُس سے جانداروں کا بدن مراد ہے اور بہت سی جگہ آدمی کا جسم اور اسکی حرکتیں اور بدن بھی اس معنی میں آیا ہے اور یہ دونو لفظ سُومت کے برخلاف مستعمل ہیں مثلاً کرنتھیوں کے دوسرے خط کے ۷ : ۱ میں اور اس سے ایک اور معنی بھی نکلتے ہیں یعنے آدمی کا وہ حال جو اس دُنیا میں خواہ مخواہ ہوتا ہے جیسا کہ پولوس گلتیوں کے خط کے ۲ : ۲۰ میں کہتا ہے کہ "میں سارک میں جیتا ہوں" اور کرنتھیوں کے دوسرے خط کے ۱۰ : ۳ میں کہ "ہم سارک میں چلتے ہیں" اور فلپیوں کے خط کے ۱ : ۲۲ +

---

[1] یہ یہودیوں کی اُن کتابوں کے مجموعہ کا نام ہے جو عہد نامہ عتیق کے پیچھے اور مسیح سے پیشتر لکھی گئیں۔ یہ یونانی میں لکھی گئیں اور نہ یہودی اُن کی سند مانتے ہیں نہ پروٹسٹنٹ لوگ +

Scanned by CamScanner

اور ۴:۸ میں کہ "سارک میں جیتا رہنا اور سارک میں باقی رہنا" اور جہاں مسیح کی سارک مذکور ہے مثلاً کلسیوں کے خط کے ۱: ۲۲- اور عبرانیوں کے خط کے ۵: ۷- اور ۱۰: ۲۰ میں وہاں بھی اُس کے یہی معنی ہیں- پھر کرنتھیوں کے دوسرے خط کے ۱۱: ۱۸- اور گلتیوں کے خط کے ۶: ۱۲- و ۱۳- اور افسیوں کے خط کے ۶: ۵- اور فلپیوں کے خط کے ۳: ۳ اور ۴ اور فلیمون کے خط کی ۱۶- آیت میں بھی یہی مراد ہے لیکن ان آیتوں میں وہ علاقہ جو آدمی اس دنیا سے رکھتا ہے اور وہ علاقہ جو خدا سے رکھتا ہے باہم ضد کے طور پر مذکور ہیں- اور اس سے ایک اور معنی نکلتے ہیں یعنے خود انسانیت جیسے کہ خواہ مخواہ اس دنیا میں ہے- مثلاً یوحنا کے ۱: ۱۴- اور تمتھیس کے پہلے خط کے ۳: ۱۶- میں- لیکن ان سب معنوں کے سوا لفظ یاسار کی طرح عہد نامہ جدید میں لفظ سارک کے ایک اور معنی پائے جاتے ہیں یعنی انسان کا وہ حال جو خدا کے بندوبست سے نہیں بلکہ انسان ہی کی بدی سے ہے دنیا کا وہ علاقہ نہیں جو خدا کے علاقہ سے صرف جدا ہے بلکہ وہ علاقہ جو اُس کے برخلاف ہے یعنی آدمی کا وہ میلان جس سے وہ خدا کی طرف سے پھر کر دنیا کی طرف متوجہ ہوا سارک ہونا سارک کے مطابق رہنا- یا جینا یا چلنا یا سپاہگری کرنا بلکہ رومیوں کے خط کے ۷: ۵- اور ۸: ۸ میں سارک میں رہنا بھی- اِن سب محاورات کے عہد نامہ جدید میں بھی معنے پائے جاتے ہیں- اس واسطے جس کو یوحنا اپنے پہلے خط کے ۲: ۱۶ میں دنیا کی خواہش کہتا ہے اُسی کو پولس گلتیوں کے خط کے ۵: ۱۶- اور افسیوں کے خط کے ۲: ۳- میں سارک کی خواہش کہتا ہے لیکن یوحنا کے نزدیک سارک کی خواہش دنیا کی خواہش کا صرف ایک جزو ہے- غرض سارک کی بنیاد وہ خود غرضی

ہے جو تمام گناہ کی اصل ہے +

پس جہاں جہاں سارک اور رُوحت اس طرح آپس میں ضد کے طور پر مذکور ہیں کہ سارک سے بُرائی اور رُوحت سے نیکی نکلتی ہے وہاں رُوحت سے انسانی رُوح مراد نہیں ہے بلکہ خدا ہی کی رُوح مراد ہے جو انسانی رُوح میں سکونت کر کے اپنا کام کرتی ہے۔ کیونکہ جو کچھ بعض جگہ بغیر خدا کے نام کے رُوح کے حق میں کہا گیا ہے وہ اَور جگہ خدا کے نام کے ساتھ ہی پایا جاتا ہے۔ بلکہ بعض جگہ انسان کی رُوح کی نسبت یہ آیا ہے کہ اُس کے لئے پاکیزگی چاہئے مثلاً کرنتھیوں کے پہلے خط کے ۷: ۳۴۔ اور دوسرے خط کے ۷: ۱۔ اور تسلنیکیوں کے پہلے خط کے ۵: ۲۳۔ میں ایمانداروں کے بدن کے حق میں پولوس اتنا ہی کہتا ہے کہ اُسے [1] غلامی میں رکھنا چاہئے لیکن اُن کی سارک کے حق میں یہ کہتا ہے کہ وہ مصلوب ہوئی۔ اور کرنتھیوں کے پہلے خط کے ۳: ۳۔ میں پولوس سارکِک ہونے کا یہی مطلب بیان کرتا ہے کہ تم انسانی طور پر چلتے ہو یعنی تم خدا کی مرضی کو اپنا مقصد کر کے نہیں چلتے بلکہ انسان ہی کی مرضی کو اپنا مقصد کر کے چلتے ہو۔ اور جیسا پولوس رومیوں کے خط کے ۸: ۷ میں کہتا ہے کہ سارک کا مزاج یا خیال خدا کی دشمنی ہے ویسا ہی یعقوب اپنے خط کے ۴: ۴ میں اور یوحنا اپنے پہلے خط کے ۲: ۱۵ میں دنیاوی محبت کا یہی بیان کرتے ہیں کہ وہ خدا کی دشمنی ہے۔ اس رومیوں کے خط کے ۸: ۱۳ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بدن کے کاموں سے جو کچھ مراد ہے وہی سارک کے مطابق زندگی گذراننے سے بھی ہے لیکن یہ کچھ ضرور نہیں ہے بلکہ بدن کے کام سارکِک چال چلن کی ایک قسم ہی جا ہو سکتے ہیں +

[1] کرنتھیوں کے پہلے خط کے ۹: ۲۷۔ کو دیکھو +

دو مقام ہیں جن میں بدن کے بھی وہی معنی معلوم ہوتے ہیں جو سارک کے ہیں یعنے رومیوں کے خط ۶: ۶- اور کلسیوں کے خط کے ۲: ۱۱- لیکن رومیوں کے خط کے ۶: ۶- میں جس یونانی لفظ کا ترجمہ نیست کرنا ہے اُس کے لغوی معنی بیکار کر دینا ہیں اور کلسیوں کے خط کے ۲: ۱۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُتار پھینکنے سے بھی یہی مراد ہے یعنے جو چیز بطور لباس ہم پر پڑی اور ہم کو قابو میں کئے ہوئے ہے اُسکو اُتار کر پھینک دینا اور اُس کے قابو سے نکل جانا +

شاید اسی سبب سے پولوس سارک کا اس معنی میں استعمال کرتا ہے کہ اُس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گناہ کا سبب آدمی کی خلقت کا کچھ نقص نہیں ہے بلکہ یہی ہے کہ وہ خدا سے الگ ہو کر اپنے دنیاوی حال میں پھنس گیا ہے +

آٹھواں باب

آدمیت کے متضاد احوال

ایک اور رائے جس پر غور کرنا چاہئے یہ ہے کہ گناہ اُن متضاد چیزوں میں سے ہے جو آدمی کی ذات ہی سے تعلق رکھتی ہیں اور اس سب سے ضروری ہیں- اس رائے کا بیان یہ ہے کہ قوت اور زندگی تمام خلقت میں جہاں کہیں ہے متضاد چیزوں کے اختلاط سے پیدا ہوتی ہے- اور جس کا حال ایسا نہیں ہے وہ بے جان اور بے تاثیر ہے- اگر نور اکیلا ہوتا تو اچھا نہ ہوتا- نور اور تاریکی دونوں کے ہونے سے خوشی ہوتی ہے- درختوں اور جانداروں میں سے جتنا کوئی کامل تر ہے اُتنا ہی زیادہ اُس میں متضاد چیزوں کا اختلاط ظاہر ہوتا ہے-

بلکہ متضاد چیزوں کے ملانے ہی سے اُن کی ترقی ہوتی ہے۔ پس اگر آدمی کی روح میں بھی ایسی متضاد چیزیں معلوم ہوتی ہیں اور ترقی کے واسطے ضرور ہیں۔ تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔ اگر دکھ نہ ہوتا تو سکھ کی قدر نہ ہوتی۔ اگر بیماری نہ ہوتی تو تندرستی کی خوبی نہ کھلتی۔ اگر محنت نہ ہوتی تو آرام کا مزا نہ آتا۔ اسی طرح اس رائے کے مطابق نیکی اور بدی کا بھی حال ہے۔ صرف بدی ہی کا مزا چکھنے سے نیکی پہچانی جاتی ہے پس جیسے سچائی کے واسطے غلطی ضرور ہے ویسے ہی نیکی کے واسطے بدی بھی ضرور ہے۔ نری نیکی اور نری بدی صرف خیال ہے اور دونو کے ملنے سے ترقی ہوتی ہے۔ پھر اگر بدی کی مخالفت نہ کرنی ہوتی تو نیکی بیکار اور سست ہو جاتی۔ ہاں جب بدی حد سے زیادہ ہوتی ہے تو البتہ نفرت کے لائق ہو جاتی ہے ورنہ جب تک محدود رہتی ہے۔ اُس وقت تک اُس سے اچھا ہی نتیجہ نکلتا ہے۔ اور اگرچہ بدی کی حقیقت خود غرضی ہے پھر بھی اس میں کچھ نقصان نہیں۔ جس طرح جنگل میں مضبوط درخت بہت سے پیڑوں کو دبا دبا کر اور زمین کی تری اور دھوپ اُن سے کھینچ کھینچ کر بڑا اور عمدہ درخت ہو جاتا ہے اسی طرح ضرور اور مقرر بلکہ مفید بھی ہے کہ ہر شخص اپنی ہی ترقی چاہے کیونکہ اسی سے سب لوگ ترقی کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ اور اگرچہ جنگ سے نقصان تو بہت ہوتے ہیں لیکن اگر صلح ہی ہمیشہ رہتی تو زیادہ نقصان ہوتا مثلاً ہوا اور سمندر اگر آندھیاں نہ چلتیں تو خراب ہو جاتے۔ پھر اس رائے والے یہ تمثیل بھی دیتے ہیں کہ اگر سیارے صرف سورج کی طرف کھینچے جاتے اور اپنی اپنی طرف نہ کھینچتے تو اُن کی سطح پر کچھ نہ رہ سکتا بلکہ وہ سورج میں غرق ہو جاتے اسی طرح آدمیوں کو نہ صرف کل بنی آدم کی اور خدا کی بلکہ اپنی اپنی محبت بھی کرنی

بہت ضرور ہے - اور اگر بدی سے بہت سے شخص مغلوب ہو کر برباد بھی ہوں تو کچھ مضایقہ نہیں اِس سے عموماً بنی آدم کا فائدہ اور ترقی ہی ہوتی ہے +

یہ رائے البتہ ایک بات میں اوپر والی رائے سے بہتر ہے کیونکہ اُس رائے سے یہ نکلتا ہے کہ بدی نہ انسان کی ناتمامی سے ہوتی ہے اور نہ جسم کے غلبہ سے بلکہ خود اُس کی رُوح ہی میں سکونت رکھتی ہے - یہ رائے نٹشے ازم اور ڈوآلزم[1] دونوں سے علاقہ رکھتی ہے جب اس کے ماننے والوں میں نیکی اور بدی کی تمیز بڑی ہوتی ہے تو وہ ڈوآلزم کی طرف مائل ہوتے ہیں اور جب تھوڑی ہوتی ہے تو نٹشے ازم کی طرف - پہلی قسم کے لوگوں میں لکٹنٹی جو ۳۰۰ عیسوی کے قریب گذرا ہے اور دوسری قسم کے لوگوں میں رسٹوک فیلسوف ایری گنا اور اپنی پہلی کتابوں کی تصنیف کے وقت مانی خایوں کے ڈر کے مارے آگسٹین بھی تھا - حال کی صدی میں اِس رائے کی بڑی ترقی ہوئی +

اِس رائے کا لحاظ کرنا خصوصاً تین سببوں سے نہایت ہی ضروری ہے +

۱ - اگر گناہ دُنیا کی ترقی کے واسطے ضرور ہے تو اُس کی اصل ہم میں نہیں ہے اور نہ ہم اُس کے جواب دِہ ہیں +

۲ - اِس رائے کو تسلیم کر کے اگر ہم مسیح کی بیگناہی کو مانیں تو اُس کی حقیقی آدمیت نہیں مان سکینگے اور اگر اُس کو حقیقی آدمی سمجھیں تو اُسکو بیگناہ نہیں سمجھ سکینگے +

۳ - اگر انسانی زندگی اور ترقی کے واسطے گناہ ضرور ہے تو

---

[1] ڈوآلزم اُس رائے کا نام ہے کہ دُنیا کے دو اصول ہیں ایک نیک دوسرا بد - پرانا فارسی مذہب دوائیت کا خاص مظہر ہے +

ہمیشہ کی زندگی کی ہم کو کیسی اُمید ہے۔ پس بیگناہی اور بے درجی اور محض محبت سے ہم کو فائدہ نہیں بلکہ بڑا نقصان ہوگا +

لیکن کیا یہ رائے صحیح ہے؟ کیا نیکی اکیلی ہو کر سچ مچ سُست ہوتی ہے؟ اگر نیکی بدی ہی کے ساتھ ہو کر موثر ہوتی تو فی الحقیقت نہ نیکی نیک ہوتی اور نہ بدی بد۔ وہ محبت کیا جس کا اثر محبوب کی دشمنی بغیر نہ ہو اور یہ بھی صحیح نہیں کہ نیکی کی حقیقت سُستی ہے اور بدی کی حقیقت زبردستی بلکہ سستی اور زبردستی دونو بُری ہیں اور نیکی کے واسطے استقامت اور چستی دونو چاہئیں +

دو عقیدے ہیں جن سے اِس رائے کی نادرستی پہچانی جائیگی۔

۱۔ یہ کہ بغیر گناہ کے آدمیت جو متضاد باتوں سے بھری ہوئی ہے خدا کے انتظام کے مطابق اپنے کام کے لئے کافی ہے۔ پتھر میں دو متضاد قوتیں ہیں اُس کا سکون اور وزن۔ درخت میں بھی یہ دونو قوتیں ہیں لیکن اُس کی روح نباتی سے مغلوب رہتی ہیں۔ جانداروں میں نہ صرف درخت کی مانند باہر کی تاثیروں کے قبول کرنے کی قوت ہے بلکہ بالارادہ حرکت کرنے کی بھی قوت ہے۔ یہ ساری متضاد باتیں انسان کے بدن میں پائی جاتی ہیں۔ آدمی کی رُوح میں بے شمار متضاد میلان ہیں اور یہ منصرف ہر شخص کا حال ہے بلکہ جس قدر کسی شخص میں ان متضاد چیزوں میں سے کوئی چیز غالب ہو اُسی قدر وہ اور شخصوں سے متفاوت ہوگا۔ اس طرح آدمیت کی تمام خوبیوں کا ایک چھوٹا سا حصہ کسی ایک آدمی میں پایا جاتا ہے اور ہمیشہ ایسا ہی رہیگا۔ لیکن ان ساری متضاد باتوں میں کچھ گناہ نہیں ہے۔ وہ خدا کی طرف سے مقرر ہوئی ہیں مگر اس لئے نہیں کہ ایک دوسرے کو روکے اور نیست کرنا چاہے بلکہ اس لئے کہ سب مل کر ایک دوسرے کی مدد کریں اور سب مل کر تمام انسان

کو فائدہ پہنچائیں پس صرف اوروں کی محبت ہی سے اپنی ترقی کر سکتا ہے +

لیکن نیکی اور بدی کا اختلاف اُن سببوں سے الگ ہے ہاں خدا کے ٹھیرائے ہوئے ایسے بھی اختلاف ہیں جو نیکی اور بدی کے اختلاف کے مشابہ ہیں مثلاً نور اور تاریکی - گرمی اور سردی کا اختلاف - لیکن تشبیہ کچھ دلیل نہیں ہے - نیکی وہی ہے جو آدمی از خود اپنی ہی ترقی سے کرے اور جب اس ترقی کے واسطے وہ ساری متضاد باتیں ضرور ہیں تو نیکی اُن سببوں سے علاقہ رکھتی ہے اور اُن سببوں سے یعنے اُن کے ملانے سے اپنا کام کر لیتی ہے - ہاں نیکی کی اصل یعنے خدا کی محبت یکتا ہے لیکن وہ اپنی یکتائی میں رہ نہیں سکتی بلکہ خدا کی ٹھیرائی ہوئی ساری متضاد باتوں سے ظاہر ہونا چاہتی ہے - اسی طرح استقامت اور چالاکی - محافظت اور ترقی - تنہائی اور رفاقت - تفریق اور جمع - صبر اور زور کے سیلان اور نیز اور سب متضاد سیلان نیکی کے کام آ سکتے ہیں +

ایک طرح سے بدی نیکی کی پہچان کا سبب ہوتی ہے یعنے جو لوگ بد سے نیک ہوتے ہیں اُن کو بدی کے اختلاف کے سبب نیکی بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے - لیکن یہ صرف خدا کے فضل سے ہوتا ہے جیسا رومیوں کے خط کے ۵: ۲۰ میں لکھا ہے کہ جہاں گناہ بڑھا وہاں فضل بہت زیادہ بڑھا - ایک پرانے گیت میں آدم کے گناہ کو مبارک لکھا ہے اسواسطے کہ وہ مسیح کی نجات کا سبب ہوا لیکن ایسا کہنا خطرناک ہے - گناہ نہ صرف نیکی کی ضد ہے بلکہ اُس کا جانی دشمن ہے - دو فوا ایک دوسرے کو نیست و نابود کرنے کے لئے کمر باندھے رہتے ہیں - اگر نیکی بدی کے وسیلے سے اپنا کام کر لینا چاہتی تو وہ نیکی نہ رہتی +

یہ تو بالکل غلطی ہے کہ نیکی صرف استقامت اور صبر ہے چنانچہ مسیح

بڑے زور کے ساتھ بدی کا مقابلہ کرتا اور منکروں کو ڈانٹتا تھا +

اگر گناہ آدمیت کے واسطے ضرور ہے اور اس ضرورت کے سبب یہ دنیا ایسی ہی ہے جیسی ہونی چاہئے تو جلال کی بادشاہت کی اُمید جو خدا کے کلام میں مذکور ہے یا باطل ٹھیرتی یا بُری بلکہ آدمی کے واسطے یہی اچھی اُمید ٹھیرتی کہ نیکی اور بدی کی اس لڑائی سے چھٹ کر چاہے نروان حاصل کرے اور چاہے برہما میں لین ہو جائے اور اِن دونو کا نتیجہ فی الحقیقت ایک ہی ہے +

لیکن کلیسیا خدا کے کلام اور رُوح القدس کی ہدایت سے ایسے جھوٹھ سے محفوظ رہی۔ چنانچہ وہ گناہ کو کسی طرح ضرور نہیں بلکہ ہر صورت سے مزاحم سمجھ کر خدا کی اُس بادشاہت کے کمال کی اُمیدوار رہتی ہے جس کی اس دُنیا میں ابتدا ہی ہے اور جانتی ہے کہ جب اس بادشاہت کا کمال ہو گا اُسی وقت آدمی کا حال جیسا چاہئے ویسا ہونا شروع ہو گا +

۲ — وہ عقیدہ جو اس رائے کے برخلاف ہے یہ ہے کہ گناہ صرف الگ الگ فعل نہیں ہے بلکہ ایک تاثیر بھی ہے جس نے تمام آدمیت بگاڑ دی اور اپنے مقصد پر پہنچنے سے رہ گئی ہے۔ یہ ابھی صرف فرضاً کہا جاتا ہے۔ بعد ثابت کیا جائیگا) گناہ کی جڑ جو آدمی کے دل ہی میں لگی ہوئی ہے اُس کی شاخیں جس طرح کوئی بیل درخت پر لپٹ کر اُس کو خشک اور بیکار کر دیتی ہے اس طرح آدمی کی تمام زندگی اور حالات میں لپٹی ہوئی ہیں۔ اُس کی عقل میں غلطی۔ اُس کے خیالوں میں ناپاکی۔ اُس کے جسم میں دُکھ سمایا ہوا ہے۔ بلکہ گناہ کی تاثیر آدمی کے سوا اور مخلوقات میں بھی پھیل گئی ہے۔ مخلوقات کہیں بالکل آدمی کی تابعدار نہیں ہے بلکہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود آدمی مخلوق کا تابعدار بنجاتا ہے۔ اور نہ صرف وہ علاقہ جو اور مخلوقات کو آدمی سے رکھنا چاہئے

فاسد ہو گیا ہے بلکہ آدمی کے علاقہ سے علاوہ بھی مخلوقات میں گناہ کی بہت تاثیر پھیلی ہوئی ہے۔ خوبصورت اور بدصورت چیزیں اکٹھی پیدا ہو کر رہتی ہیں اور کسی جنس کا مقصد کسی فرد سے پورا نہیں ہوتا۔ بلکہ آدمی کے جو سب سے زیادہ مکروہ گناہ ہیں مثلاً حسد۔ فریب عداوت خونریزی اور اوروں کے دکھوں سے خوشی کرنی اُن کی پیروی بعض قسم کے جانور اپنی طبیعت ہی سے کرتے ہیں۔ غرض جو کچھ ہم ہیں اور جو کچھ ہم دیکھتے ہیں وہ یہاں تک گناہ کا پابند اور اس سے بھرا ہوا ہے کہ ہم خیال بھی نہیں کر سکتے کہ بیگناہ آدمی کی ترقی اور زندگی کیا چیز ہے۔ ہاں مسیح کی بیگناہ زندگی کا بیان تو انجیل میں موجود ہے لیکن ایک تو یہ بیان بہت ہی مختصر ہے اور دوسرے چونکہ مسیح گنہگاروں کے درمیان رہا اس واسطے اُس کی اندرونی بیگناہی کامل طور پر کام نہیں آسکی +

اس سبب سے جب ہم بیگناہ آدمیت کا خیال کرنے لگتے ہیں اور ترقی اور سب طرح کے کاموں کے اُن اسباب سے قطع نظر کرتے ہیں جو گناہ سے ہوتے ہیں تو جو انسانی زندگی ہمارے خیالوں میں باقی رہتی ہے اُس کا کسی قدر بے لطف معلوم ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں اور جو لوگ خدا کی مقاربت سے ناواقف ہیں اُن کو خاص کر ایسا معلوم ہوگا وہ یہ سمجھ بھی نہیں سکتے کہ بُری خواہشوں سے الگ ہو کر آدمی پھر کیا کر سکتا ہے +

پس کچھ تعجب نہیں کہ جب گناہ آدمیت پر غالب ہو گیا تو وہ متضاد باتیں جو از خود آپس میں مخالف نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کی مدد اور ترقی کے لئے ہیں گناہ کی تابعدار ہو کر مخالفت کی بھی باعث ہوں۔ اسی سبب سے حق ہزاروں غلطیوں کی راہ سے اور آرام ہزاروں دکھوں کے وسیلے سے حاصل ہوتا ہے پس زور آوروں کو نیکی کی منزل پر پہنچنا اوروں کی نسبت زیادہ مشکل ہوتا ہے کیونکہ اُن کی متضاد باتیں آپس میں زیادہ مخالف ہوتی ہیں اور اگر اس لڑائی سے تھک کر وہ یہ قول پیش کریں

کر سامری بھی کو دوش نہیں لگتا تو اُن پر افسوس ہے +

تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی طرح کی ترقی برابر نہیں ہوتی رہی بلکہ یہ قاعدہ رہا ہے کہ کبھی تو آدمی بڑے زور سے ایک طرف چلے جاتے ہیں اور کبھی اتنے ہی زور سے دوسری طرف پھر جاتے ہیں اور ہر پشت کے لوگ نہ صرف پچھلی پشتوں کی بنیاد پر اپنی عمارت قائم کرتے ہیں بلکہ اُس کو بالکل مٹا کر اُس کی جگہ اپنی نئی بنیاد بھی ڈالتے ہیں۔ ہاں جب سے مسیحی دین کا چشمہ کھل گیا ہے اُس وقت سے آدمی کے حالات میں اس چشمہ سے برکتوں کا ایک دریا جاری ہے اور اُس کے سبب سے وہ ہلاکت سے محفوظ رہا ہے اور جس طرح طوفان سے زمین پھر نہیں ڈوبے گی اسی طرح کلیسیا ہلاک نہیں ہونے کی مگر پھر بھی اُس کی ترقی آدمیت کی مخالف متضاد باتوں سے ہمیشہ رُکی رہتی ہے اور کبھی اِس طرف کبھی اُس طرف جوش و خروش کے ساتھ چلی جاتی ہے +

اِن سب باتوں کا سبب یہ ہے کہ گناہ آدمیت کے رگ و ریشہ میں بیٹھ گیا ہے۔ جنگ سے کیوں فائدہ ہوتا ہے ؟ اِس واسطے کہ صلح سے اور طرح طرح کے گناہ ترقی پاتے ہیں۔ لیکن جنگ سے اگرچہ بعض بُرائیوں کی جڑ کٹ جاتی ہے مگر پھر بھی اور بہت سی بوئی جاتی ہیں +

جب اِس رائے کے طرفدار یہ دیکھتے ہیں کہ رائے مذکور انسان کے افراد پر صادق نہیں آتی تو وہ یہ کہہ کر اُس کو عموماً انسان کی جنس پر صادق کرنا چاہتے ہیں کہ بہت سے فردوں کی ہلاکت سے باقی آدمیوں کا یعنی عموماً بنی آدم کا فائدہ ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ رائے کرنتھیوں کے پہلے خط کے ۱۱: ۱۹ - اور تمتھیس کے دوسرے خط کے ۲: ۲۰ - اور رومیوں کے خط کے ۹: ۲۱ و ۲۲ و ۲۳ سے ثابت ہے۔ لیکن کرنتھیوں کے پہلے خط کے ۱۱: ۱۹ میں پولوس یہ کہتا ہے کہ جب پھوٹیں ہو سکتی ہیں تو خدا کی مرضی

سے بدعتیں بھی اُن سے پیدا ہوتی ہیں تاکہ جو بُرائی موجود ہے اُس کے ظہور پانے سے اچھے لوگ اُس سے زیادہ الگ ہوں اور تمیز ہوں دوسرے خط کے باب میں وہ خدا کی مرضی کا کچھ ذکر نہیں کرتا بلکہ کلیسیا کا جو حال اب ہے اُسی کا ذکر کرتا ہے۔ رومیوں کے خط کے ۹ باب سے یہ بات تو ثابت ہوتی ہے کہ سب آدمی تو گنہگار ہیں لیکن گناہ کے پیدا ہونے کا اُس میں کچھ ذکر نہیں ہے۔ اور چونکہ ہر شخص خدا کی صورت پر پیدا ہوا اس لئے ممکن نہیں ہے کہ خدا باقی آدمیوں کے واسطے ایک کو ہلاک کرے۔

نواں باب

دُوا لِسما

ایک اور رائے پر غور کرنی چاہئے جو یورپ میں دُوا لِسما کہلاتی ہے اور جو فینتھے اِسم کی ضد ہے اور جس سے نیکی اور بدی کا فرق نہ صرف مٹایا ہی نہیں جاتا (جیسا کہ فینتھے اِسم میں مٹایا جاتا ہے) بلکہ حد سے زیادہ بڑھایا بھی جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی فینتھے اِسٹوں کا دُوا لِسے ہو جانا بہت مشکل نہیں ہے کیونکہ جب یہ ماننا ضرور ہے کہ نیکی اور بدی کا ظہور دنیا میں متفرق ہے تو جو لوگ خدا کو دور سے بے فکر سمجھتے ہیں اُن کو یہ بھی ماننا آسان ہوتا ہے کہ اُس بے فکر برہما کے سوا دو اور دیوتا ہیں جن میں سے ایک نیکی پر حکومت رکھتا ہے اور دوسرا بدی پر۔ لیکن بہت سی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ دوالِسے کے اختیار کرنے کا سبب نیکی کے لئے سرگرمی ہوتی ہے۔ کیونکہ جو ایسے سرگرم ہیں وہ بدی کو نیکی سے بالکل علیحدہ سمجھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ مانی کا مقصد تھا جس کے پیرؤوں سے جو مانیؔ نے کہلاتے تھے کلیسیا کا بڑا نقصان ہوا۔ لیکن یہ اچھی مراد نہ صرف پوری ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کے خلاف ہی

ہوتا ہے کیونکہ جب بدی کی کوئی حقیقت سمجھی جاتی ہے تو آدمی کا اُس کے قبضہ میں پڑنا اور پھر اُس سے چھوٹنا آدمی کی مرضی پر نہیں بلکہ دنیا کے کسی جبر پر موقوف معلوم ہوتا ہے مسیحی دین میں نہ صرف خدا کی مخالفت کا امکان مانا جاتا ہے بلکہ دنیا میں اُس کا ایک خاص مخالف بھی مانا جاتا ہے لیکن دو آئینے میں یہ مخالف اُس سے آزاد ہے اور اُس کی مانند ازلی ہے اور اس طرح سے خدا نہ صرف اپنے تئیں محدود کرتا ہے (جیسا مسیحی لوگ بھی مانتے ہیں) بلکہ دوسرے سے بھی محدود کیا جاتا ہے +

جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ نیکی گناہ سے آزاد ہے تو دو آئینہ صاف رد ہو جاتا ہے۔ ہاں جب سے بدی کا ظہور ہوا ہے اُس وقت سے اکثر نیکی اُس کے برخلاف ہی ظاہر ہوتی ہے لیکن اگر بدی نہ ہوتی تو بھی نیکی کی ہستی میں کچھ خلل نہ آتا۔ مگر برعکس اس کے بدی نیکی سے آزاد نہیں ہے۔ بلکہ صرف نیکی کے برخلاف ہی ظاہر ہو سکتی ہے۔ اگر نیکی نہ ہوتی تو بدی ہرگز نہ ہو سکتی۔ نیکی اپنے تئیں اور بدی کے تئیں بھی ظاہر کرتی ہے جیسا حق اپنے تئیں اور جھوٹ کے تئیں بھی ظاہر کرتا ہے گناہ کی خاص بدی یہی ہے کہ جو شخص ساری چیزوں کی اصلی حقیقت اور پاک محبت سے بھرپور ہے اُس کی مخالفت گناہ سے ہوتی ہے۔ اسی سبب سے پشیمانی اور اپنے سے نفرت کرنی ممکن ہے اگر خدا محبت سے پُر نہ ہوتا تو فساد اور بطلان تو ہو سکتا مگر گناہ نہ ہو سکتا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گناہ ازلی نہیں ہو سکتا +

اس کے سوا گناہ نیکی کی مدد ہی سے ہو سکتا ہے۔ گناہ از خود لوگوں کو ایک دوسرے سے ملا نہیں سکتا۔ صرف جب تک بد لوگ نیکی کی مخالفت کرتے ہیں اُس کی مخالفت کے واسطے ملے جلے رہتے ہیں اور اسی واسطے

مسیح شیطان کی بادشاہت کا ذکر کرتا ہے متی کے ۱۲: ۲۵ و ۲۶ کو دیکھو۔ لیکن جب یہ مخالفت اور زیادہ نہیں ہو سکتی یا وہ اس کو چھوڑ دیتے ہیں اُس وقت وہ آپس میں مخالفت کرنے لگتے ہیں اور گناہ کا بھید ظاہر ہو جاتا ہے یعنے یہ کہ اُس میں کچھ محبت یا میل نہیں ہے۔ پھر اس دنیا میں اگر کوئی کم و بیش اوروں کو خوش نہ کرے تو اُس کی غرض کبھی پوری نہ ہوگی۔ غرض گناہ کو خواہ مخواہ نیکی کی شریعت کا کم و بیش تابعدار ہونا پڑتا ہے +

اس سبب سے گناہ ہمیشہ چھپنا چاہتا ہے اور اپنے تئیں جیسا ہے ویسا ظاہر کرنا نہیں چاہتا بلکہ نیکی کا بھیس بدل کر اپنا کام کرتا ہے یہاں تک کہ جھوٹا بادشاہ بالکل خود مختار اور اپنی مرضی پر چلنے والا ہے اُس کو بھی کم و بیش رعیت کی بہتری کا بھیس بدل کر کام کرنا ضرور ہے +

گناہ سے منحرف آدمیوں کا ایک دوسرے سے میل نہیں ہو سکتا بلکہ ہر گنہگار کے دل میں بھی صلح غیر ممکن ہے۔ کیونکہ ایک خواہش دوسری خواہش سے لڑتی ہے اور اگرچہ گنہگار اپنے تئیں کسی ایک خواہش کے سپرد کرے پھر بھی وہ اتنا زور نہیں پکڑ سکتی کہ اور سب خواہشیں اُس سے دب جائیں۔ خاص کر گناہ کے جو دو اصول ہم دریافت کر چکے ہیں یعنی غرور اور جسمانی خواہش ان میں میل یا صلح کبھی نہیں ہو سکتی بلکہ یہ دونوں آدمی پر قابض ہونے کے لئے ہمیشہ لڑکر ایسی کھینچا تانی کرتے ہیں کہ وہ نیست ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ مسیح کے دشمنوں نے کہا جب کوئی دیو نکلتا ہے تو دیووں کا سردار ہی اُس کو نکالتا ہے۔ لیکن برعکس اس کے نیکی میں ہمیشہ میل رہتا ہے ہر ایک نیک چیز سے دوسری نیک چیز گر سکتی نہیں بلکہ سنبھلتی اور مدد پاتی ہے نیک مقصد بُرے وسیلے سے کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ نیکی کا ایک ہی دشمن ہے یعنے بدی لیکن بدی کے دشمن دو ہیں یعنے نیکی اور بدی +

بدی کا ہر چند ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتی ہے کہ خدا سے الگ ہو کر

رہے مگر رہ نہیں سکتی لیکن اگر خدا ایسا ہونے دیتا اور گنہگار سے ایسا الگ ہوتا جیسا گنہگار اُس سے الگ ہونا چاہتا ہے تو گنہگار نیست ہو جاتا اور اُس کے ساتھ اُس کی بدی بھی نیست ہو جاتی۔ پس اس طرح بدی ہمیشہ اپنی ہستی کے لئے کوشش کرتی ہے۔ وہ اُس بیل کی مانند ہے جو درخت پر چڑھی اور اُس پر لپٹی ہوئی رہتی ہے اور اُس کا سارا رس چوس کر آخر اُس کو ہلاک کر ڈالتی ہے۔ لیکن جب درخت ہلاک ہوا تو بیل کہاں رہا +

چوتھا حصہ گناہ کا امکان

دسواں باب

آزادی اور خود مختاری

یہاں تک یہ ثابت ہو چکا کہ آدمی گنہگار ہے اور گناہ اُس کے خالق کی مرضی اور قواعد کے برخلاف ہے کیونکہ جتنی رائیں ہم نے اِس باب میں سوچیں کہ گناہ کسی نہ کسی طرح خالق کی مرضی کے موافق ہے سب بے بنیاد ٹھہریں۔ لیکن جب ہم خالق کو مانتے ہیں اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہم بالکل اُس کے اختیار میں ہیں تو کس طرح گناہ کا بھی باعث اصلی اُس کو نہ ٹھہرائیں۔ پس اگر خود آدمیت میں ہم کوئی ایسی چیز دریافت کریں کہ جو فی الحقیقت گناہ کا باعث اصلی ہو تو ہماری قصوروار ی اور خدا کا اختیار کل دونو ثابت رہینگے نہیں تو نہیں +

بلاشبہ یہ چیز آدمی کی آزادی ہو گی۔ لیکن آزادی دو طرح کی ہے ایک تو حقیقی آزادی ہے اور دوسری کو خود مختاری کہنا بہتر ہو گا

حقیقی آزادی یہ ہے کہ آدمی کے احوال و افعال اُس کی اصل فطرت کے مطابق ہوں۔ اور آدمی کی اصل فطرت میں یہ شامل ہے کہ وہ بالکل نیک ہو اور خدا کی شریعت کا بالکل تابعدار رہے۔ جو آدمی خدا سے برگشتہ ہو اور جو آدمی نیکی اور بدی دونو کے بیچ میں لٹک رہا ہے یہ دونو آزاد نہیں ہیں کیونکہ خدا نے آدمی کو نیک اور اپنا تابعدار بنایا ہے اور اپنی اصل فطرت کے مطابق رہنا ہی اُس کے لئے آزادی ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی اُسی صورت میں حقیقتہً آزاد ہے جب وہ بالکل تابعدار ہے۔ آزادی کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ آدمی کا ہر ایک کام اُس کی طبیعت ہی سے ہو کسی غیر کے جبر سے نہ ہو بلکہ یہ بھی ضرور ہے کہ اُس کی طبیعت اُس کی اصل فطرت کے مطابق ہو۔ اور حقیقی آزادی کے واسطے یہ بھی ضرور ہے کہ یہ کلیہ تابعداری جبر نہ معلوم ہو بلکہ اس کی کلیت ہی کے سبب آدمی کی مرضی بالکل اُس بات کے مطابق ہو جو اُس پر فرض ہو۔ جب محبت کامل ہے تو آزادی اور پابندی میں کچھ فرق نہیں۔ اس آزادی سے نہ یہ مراد ہے کہ کسی غیر شے سے علاقہ نہ رہے اور نہ یہ کہ بے فائدہ ارادوں کی کثرت ہو بلکہ یہ ہے کہ خدا کی مقاربت سے قائم رہکر اور سب چیزوں سے آزاد رہے۔ مقدس کتاب میں آزادی کا لفظ صرف اسی حقیقی آزادی کے لئے مخصوص ہے۔ یہ آزادی مسیح کی نجات سے حاصل ہوتی ہے اور کہیں تو اُس کا یوں بیان ہوا ہے کہ آدمی اپنی خوشی سے خدا کی شریعت کا تابعدار ہو کر شریعت کے لفظ سے آزاد ہے اور کہیں اس طرح کہ آدمی گناہ کی حکومت سے آزاد ہے۔ کرنتھیوں کے پہلے خط کے ۷: ۲۲ اور پطرس کے پہلے خط کے ۲: ۱۶ میں لکھا ہے کہ یہ آزادی خدا کی بندگی ہے بلکہ متی کے ۶: ۱۰ اور یوحنا کے پہلے خط کے ۳: ۹ سے ثابت ہے کہ اُس میں خدا کی بندگی کرنا ضروری کام معلوم

ہوتی ہے اور رومیوں کے خط کے ۸: ۲۱ سے یہ پایا جاتا ہے کہ آیندہ دُنیا میں وہ کامل ہوگی +

لیکن اس آزادی سے اِس مقام پر ہم کو بحث نہیں کیونکہ اِس وقت ہمارا یہ مطلب ہے کہ گناہ کے امکان کا سبب دریافت کریں اور اِس آزادی میں گناہ کا امکان نہیں ہے +

خود مختاری کے یہ معنی ہیں کہ جو کام کیا جائے اُس کے عوض دوسرا کام بھی ہو سکتا ہو اور یہ بات کہ کون سا کام کیا جائے صرف فاعل پر موقوف ہو۔ اگرچہ یہ بائبل میں آزادی نہیں کہلاتی مگر پھر بھی اُس میں جو ہر جگہ کی قصور واری کا ذکر ہے اس سے آدمی کی خود مختاری بھی ثابت ہے۔ خاصکر پہلے گناہ کے بیان میں یعنی حوّا نے جو خدا کے حکم کو جان بوجھ کر بلکہ پہلے اُس کو مان کر اور اُسکی طرفداری کر پھر اُسے ٹال دیا اس سے خود مختاری مذکورہ ثابت ہے +

خود مختاری کی بہت سی غلط تعریفیں بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً ایک یہ ہے کہ آدمی کے فعل میں کسی چیز یا خیال کا لگاؤ نہ ہو۔ بلکہ صرف اُسی کی طرف سے اُس کے فعل کا صدور ہو۔ اور چونکہ اکثر اوقات آدمی کا ایسا حال نہیں رہتا اِس واسطے کہتے ہیں کہ جب آدمی چاہتا ہے اُسی وقت ایسا ہوتا ہے۔ لیکن اِس تعریف کا یہ مطلب ہوگا کہ آدمی اُس واسطے کوئی کام اختیار نہیں کرتا کہ وہ کام نیک ہے بلکہ وہ کام اس واسطے نیک ٹھیرتا ہے کہ آدمی اُسے اختیار کرتا ہے۔ غرض شریعت کوئی چیز نہیں ہے +

دوسری تعریف یہ ہے کہ آدمی اُسی حال میں خود مختار ہے جب وہ کوئی سی دو چیزوں کی طرف برابر میلان رکھتا ہے اور کسی کی طرف زیادہ جھکاؤ نہیں ہوتا۔ لیکن اِس صورت میں ایک تو یہ بات ہے

کہ آدمی صرف کبھی کبھی خود مختار ہوگا۔ دوسرے کیا یہ آدمی کی صفت میں داخل ہے کہ وہ نیکی اور بدی دونوں کی طرف برابر میلان رکھتا ہو؟

تیسری تعریف یہ ہے کہ آدمی اسی وقت خود مختار ہے جب کہ وہ جو چاہتا ہے سو کر سکتا ہے اور چونکہ ہم کو غیر چیزوں میں ایسا اختیار بہت کم حاصل ہے اس واسطے خود مختاری خاص کر یہ ہے کہ ہم اپنے دل کا حال جیسا چاہیں ویسا بنا سکیں۔ لیکن یہ ضرور نہیں ہے کہ یہ چاہنا آزادی ہو۔ اور جس صورت میں مقید بھی ہوا تو انسان اور حیوان میں کیا فرق ہوگا۔ ہر ایک ارادہ جیسا حیوانوں میں ہوتا ہے ویسا ہی انسان میں بھی کسی گزشتہ سبب کا ضروری نتیجہ ہو سکتا ہے۔ شاید اس کا جواب یہ ہو کہ انسان اپنے سے واقف رہتا ہے اور اسی سے اس کی آزادی ثابت ہے۔ لیکن یہ ہرگز ممکن نہیں کیونکہ جو خود پابند ہے وہ اپنے حال کے پہچاننے سے آزاد نہیں ہوتا۔

لیکن جب ہم خود مختاری کی وہ تعریف کرتے ہیں جو اوپر لکھ آئے ہیں یعنے ہر ایک فعل کے وقت دوسرے فعل کا امکان فاعل میں موجود ہو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود مختاری اور حقیقی آزادی بالکل دو چیزیں نہیں ہیں بلکہ خود مختاری حقیقی آزادی کا وسیلہ ہے اور حقیقی آزادی خود مختاری کا نتیجہ ہے۔ حقیقی آزادی جب تک ناتمام ہے خود مختاری ہے اور خود مختاری جب کامل ہو گئی تو حقیقی آزادی ہے۔ کیونکہ اگر پہلے بدی کرنے کا امکان نہ ہوتا تو وہ ضرورت جس سے نیک آدمی نیکی کرتا ہے کسی طرح کی آزادی نہ ہوتی بلکہ محض پابندی ہوتی۔

گیارھواں باب

ہم کس قدر خود مختار ہیں

آدمی کی خود مختاری کے درست خیال کے دونو طرف ایک ایک غلط رائے ہے جس سے خبردار رہنا ضرور ہے۔ ایک طرف تو پلاگیانوں کی رائے ہے کہ آدمی کے ہر ایک فعل میں بالکل آزادی ہے اور کوئی فعل اُس کے گذشتہ کاموں یا کسی خیال یا اور کسی سبب کے ساتھ مقید نہیں ہے غرض ہر ایک فعل گویا ایک نئی ابتدا ہے۔ لیکن اگر یہ رائے صحیح ہوتی تو نہ تعلیم اور نصیحت سے کچھ فائدہ ہوتا نہ کوئی آدمی دوسرے پر کچھ اعتماد کر سکتا نہ وہ کسی دوسرے کے کاموں کی امید کے مطابق اپنا برتاؤ رکھ سکتا اور نہ کسی کی نجات ہو سکتی بلکہ انجیل بالکل بغائدہ ہوتی اور جس کو مسیح[1] نے غیر ممکن ٹھہرایا یعنی ایک آدمی کا دو مالکوں کی بندگی کرنا اور جس کو رسولوں[2] نے غیر ممکن ٹھہرایا یعنی نور اور تاریکی کے درمیان رفاقت ہونی وہ ممکن ہو جاتا +

دوسری طرف یہ رائے ہے کہ آدمی کا ہر ایک فعل کسی سبب کا ضروری نتیجہ ہے۔ اور چونکہ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ہمارے کام خارجی اسباب کے ساتھ مقید ہیں اس واسطے اس رائے کے طرفدار کہتے ہیں کہ وہ ہمارے ہی مزاج کے ضروری نتیجے ہیں۔ یہ تو سچ ہے کہ ہمارے کام ہمارے مزاج کے نتیجے ہیں یعنے ہم اکثر اپنے مزاج کے مطابق کام کرتے ہیں بلکہ جو کام فاعل کے مزاج کے برخلاف معلوم ہوتا ہے

[1] متی کے ۶: ۲۴ کو دیکھو۔ [2] کرنتھیوں کے دوسرے خط کے ۶: ۱۴ کو دیکھو +

وہ اتفاقیہ سمجھا جاتا ہے اور اس کے سبب فاعل کی تعریف نہیں ہوتی + لیکن اس کے ساتھ دو اور باتیں یاد رکھنی ضرور ہیں۔ ایک یہ کہ ہمارا مزاج کم و بیش ہمارے پچھلے کاموں کا نتیجہ ہے مگر ہاں بالکل ایسا نہیں ہے کیونکہ ہر ایک آدمی کی ایک تو جبلی طبیعت ہے جس میں کچھ تو عام انسانی طبیعت شامل ہے اور کچھ اس کی قوم کچھ اسکے خاندان کچھ اس کے والدین کی اور کچھ اسی کی خاص طبیعت ہے اور اس جبلی طبیعت کی بابت وہ مطلق جواب دہ نہیں ہے۔ لیکن اسکے سوا ہر ایک آدمی کی ایک اور طبیعت یا مزاج ہے جو رفتہ رفتہ کم و بیش بچپن سے لے کر مرتے دم تک ظاہر ہوتا ہے۔ کم و بیش سے یہ مراد ہے کہ سب آدمیوں میں برابر ظاہر نہیں ہوتا اور اس کا سبب یہ ہے کہ یہ مزاج خود مختاری کے ساتھ جو کام ہوتے ہیں اُن کا نتیجہ ہے اور جتنی زیادہ وہ جبلی طبیعت اس مزاج سے مغلوب ہو جاتی ہے بس اسی میں خود مختاری اور جوابدہی ہے بلکہ جن لوگوں میں یہ بہت کم ظاہر ہوتا ہے اور جبلی طبیعت سے اکثر مغلوب رہتا ہے اُن میں یہ مزاج کی کمزوری ہی خود مختاری کا نتیجہ ہے اور اسی واسطے یہ ایک طرح کا مزاج ہے +

دوسری بات یہ ہے کہ جب تک مزاج پختہ نہیں ہوتا یعنے اس تمام زندگی میں وہ افعال پر ایسا غالب نہیں آتا کہ خواہ مخواہ وہ اسکے مطابق ہوں۔ قیاساً تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلاں آدمی فلاں حال میں کیا کرے گا لیکن یقیناً نہیں کہہ سکتے اور اگر بالفرض یہ ہم کو قطعاً بھی معلوم ہوتا کہ نیک آدمی فلاں گناہ نہیں کرے گا تو بھی ہم یہ نہ کہہ سکتے کہ وہ کیا کچھ کرے گا۔ اس واسطے تعلیم ہر چند بہت مفید ہے مگر ہم یقیناً نہیں کہہ سکتے کہ اُس سے کیا فائدہ ہوگا +

عادت کا اختیار نہ صرف ہماری جسمانی حرکتوں اور دل کے خیالوں پر ہوتا ہے بلکہ ہمارے نیک یا بد مزاج پر بھی وہ بڑا اختیار رکھتی ہے۔ لیکن مزاج جو چیز ہے وہ عادت سے جُدا ہے۔ حیوان صرف عادتوں ہی سے کام کرتے ہیں اور مزاج انسان کا خاصہ ہے کیونکہ مزاج میں خود مختاری ہے یہانتک کہ اگر ہم کسی کی نسبت یہ کہیں کہ اُس نے فلاں کام عادت ہی سے کیا تو یہ عیب سمجھا جائیگا۔ عادت سے تو ایک ہی طرح کا کام بار بار ہوتا ہے۔ لیکن مزاج ایک ایسا چشمہ ہے کہ اُس سے بہت سے مختلف کام ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی واسطے آدمی کی گنہگاری اُس کی عادتوں پر موقوف نہیں بلکہ اُس کے مزاج پر ہے +

ہر ایک کام کی غرض کسی قدر اُس کام کا سبب ہوتی ہے لیکن پھر اُس غرض کا سبب آدمی ہی ہوتا ہے یعنے آدمی اپنے مزاج کے مطابق مختلف باتیں اپنی طرف کھینچ لاتا اور اپنے میں ملا لیتا ہے۔ اور اِس طرح یہ باتیں اُس کے کاموں کی اغراض ہوتی ہیں +

ہر ایک چیز کی ترقی میں دو طرح کے میلان ضرور ہیں ایک تو اُس کی حفاظت کا دوسرا اُس کی خاص ترقی کا۔ حفاظت کے میلان کا یہ مقصد ہے کہ وہی چیز رہے اور ترقی کے میلان کا یہ مطلب ہے کہ اُس کی نئی نئی صورتیں بنتی جائیں۔ غیر ناطقوں کی ترقی اُن کی جنس ہی کے مطابق ہونی ضرور ہے مگر آدمی کے مزاج کی ترقی اُس کی خود مختاری سے ہوتی ہے۔ اور جو کچھ ترقی کے میلان سے آدمی میں نیا حال پیدا ہوتا ہے وہ حفاظت کے میلان کے سبب آدمی کے مزاج میں ملتا جاتا ہے پس آدمی کا مزاج رفتہ رفتہ پختہ ہو جاتا ہے۔ آدمی اِس ترقی کے قاعدہ کا پابند ہے خواہ شریعت کی پیروی میں ہو خواہ اُس کے عدول میں چنانچہ مسیح متی کے ۱۲: ۳۳ میں فرماتا ہے "درخت کو اچھا بناؤ تو اُس کا پھل اچھا

ہو گا اور درخت کو برا بناؤ تو اُس کا پھل برا ہو گا"۔

بارھواں باب

پوری خود مختاری

جب کسی کو گناہ پہلے پہل معلوم ہوتا ہے تو وہ اپنے تئیں اُس کی نسبت بالکل خود مختار اور جوابدہ جانتا ہے۔ لیکن جب اُس گناہ کا سبب سوچتا ہے اور دنیا کا زیادہ تجربہ اُسے ہو جاتا ہے تو اُس پہلی رائے کے برخلاف اُس کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے یعنے وہ اپنے تئیں گناہ کی نسبت بالکل مجبور سمجھتا ہے۔ پھر جب اِس سے بھی زیادہ علم اُس کو حاصل ہوتا ہے تو وہ اِن دونوں راؤں کی درستی اور نادرستی کو پہچانتا ہے اور ہر ایک فعل میں کسی قدر آزادی اور کسی قدر مجبوری جانتا ہے جیسا کہ گیارھویں باب میں بیان ہو چکا ہے۔

لیکن پوری قصورداری کے واسطے پوری خود مختاری ضرور ہے۔ یہ تو کچھ ضرور نہیں کہ ترقی کے ہر وقت میں خود مختاری پوری ہو کیونکہ اگر ترقی کے پہلے فعل میں پوری خود مختاری تھی تو اُس فعل سے جو قصورداری ہوئی ہے وہی قصورواری ان سب کاموں میں بھی موجود ہوتی ہے جو اُس فعل سے پیدا ہوں۔

لیکن ترقی کے شروع میں پوری خود مختاری چاہئے نہیں تو نہ اُس وقت کے فعل میں اور نہ اُس کے بعد کسی دوسرے فعل میں پوری قصورداری ہو گی۔

اس سے دو نتیجے نکل سکتے ہیں ایک یہ کہ آدمی کی پوری قصورداری نہیں ہے دوسرا یہ کہ اگرچہ آدمی اب بالکل خود مختار نہیں ہے مگر کبھی پہلے

ضرور تھا۔ ان دونوں میں سے ایک نہ ایک کو ماننا ضرور ہے۔ پس کس کو مانیں؟ پہلی بات البتہ زیادہ آسان ہے لیکن اس کے برخلاف دو باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ہمارے دل اگر فلسفہ سے خراب نہیں ہوئے تو وہ ہم کو نہ صرف ہمارے فعلوں سے بلکہ اُس مزاج اور اُن عادتوں سے بھی جن سے ہمارے فعل نکلتے ہیں قصوروار ٹھیراتے ہیں۔ مثلاً فلاں آدمی نے کوئی بُرا کام کیا۔ کیوں؟ اس واسطے کہ اُس کا دل بُرائی کی طرف مائل ہے۔ خیر! لیکن اس سبب سے کسی سیدھے سادے آدمی کا دل کبھی اُس کو معذور نہیں ٹھیرائیگا۔ بلکہ اس بُرے میلان کا بھی اُس کو جواب دہ ٹھیرائیگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر آدمی کی پوری قصوروار نہیں ہے تو یہ شک ہوتا ہے کہ کس طرح خدا گناہ کے سبب ایسا غضبناک ہو سکتا ہے کہ نہ صرف اپنے کلام میں ہمیشہ کے عذاب کی وعید کرے بلکہ اس دنیا میں بیدار آدمی کے دل میں اُس کا قہر بے انتہا معلوم ہو۔ اگر ہم اقرار کریں کہ آدمی ابتدا میں بالکل خود مختار تھا تو اس ابتدا سے کون سا زمانہ مراد ہے۔ اس کے دو جواب دیے گئے ہیں ایک یہ کہ جب کبھی گناہ باوجود تمیز کی روشنی کے ہوتا ہے اُس وقت بُری عادت کی سب سے پہلی ابتدا ہوتی ہے اور کمال خود مختاری سے گناہ ہوتا ہے۔ لیکن اس میں دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ یہ ٹھیک ٹھیک پہچاننا مشکل ہے بلکہ محال ہے کہ ہر ایک گناہ کس قدر باوجود تمیز کے ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ باوجود تمیز کے بھی جو گناہ ہوتے ہیں وہ پہلے گناہوں کے کم و بیش نتیجے ہو سکتے ہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ ابتدا اُس وقت ہوتی ہے جس وقت پہلے پہل بچہ شریعت سے واقف ہو کر گناہ کرتا ہے لیکن اس میں یہ بات ہے کہ کوئی یقیناً یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس طرح کس وقت ہوتا ہے۔ کیونکہ اگرچہ بہت سے لوگوں کو کسی خاص طرح کا اپنا پہلا گناہ یاد رہتا ہے

لیکن پھر بھی جب زیادہ غور کر کے سوچتے ہیں تو اس سے اور پہلے گناہ پہلے گناہ کی طرف میلان یاد آتا ہے اور جب اس کی اصل دریافت کرنی چاہتے ہیں تو اور اس سے پہلی ابتدا نظر نہیں آتی بلکہ جوں جوں نظر دوڑاتے ہیں زیادہ دھندلا سا نظر آتا ہے یہاں تک کہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کب اور کس طرح گناہ شروع ہوا۔ پس اگر ایسی سب سے پہلی ابتدا ہوتی تو کیا بہت صفائی سے ہمیشہ یاد نہ رہتی۔ اور یہ بھی بڑے تعجب کی بات ہے کہ خدا ایسی کمزوری کے زمانہ یعنے لڑکپن کو ایسے بھاری کام کا وقت ٹھیرائے کہ جس پر ساری زندگی کی جواب دہی موقوف ہو +

پس اس سوال کا کوئی جواب نہ رہا کہ کس طرح سے ہماری پوری قصوروار ہے۔ ہماری عقل میں تو یہ بات نہیں آتی لیکن چونکہ ہمارا دل صاف گواہی دیتا ہے کہ ہم پورے پورے قصوروار ہیں تو ایسا ہی ماننا چاہئے +

تیرھواں باب

خدا کی خالقی اور آدمی کی خود مختاری

دہریوں اور پچھے استوں کو گناہ کا حال بیان کرنا کچھ مشکل نہیں ہے مگر جو ایک خدا کو دنیا سے علیحدہ اور ساری چیزوں کا خالق سمجھ کر اس کی پرستش کرتے ہیں انہیں گناہ کی اصل بیان کرنی ایسا سر بستہ بھید معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کھولنے میں ان کو حیران و پریشان ہونا پڑتا ہے۔ اس باب میں ہم کو اس بات کے دریافت کرنے میں کوشش کرنی چاہئے کہ باوجود خدا کے کس طرح گناہ کا وقوع ممکن تھا پس پہلے ہم یہ غور کریں کہ خدا کیا ہے؟ خدا تو ایک شخص ہے خود دان

اور خود مختار۔ لیکن خدا کے سوا اَور بھی خود دان اور خود مختار شخص ہیں تو خدا کی شخصیت میں خصوصیت کیا ہے۔ یعنے کس طرح خدا کی شخصیت مطلق ہو؟ شخصیت کے واسطے یہ ضرور ہے کہ شخص اپنے تئیں ایک جانے اور بہت بھی جانے یعنے اپنی بہت سی صفات اور احوال میں اپنے تئیں ایک جانے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو محض ایک سمجھنا غلطی ہے۔ خدا ایک تو ہے لیکن اُس میں مختلف صفتیں ہیں نہ صرف ہماری دانست میں بلکہ فی الحقیقت ورنہ ہم اُس کو کسی طرح نہ جان سکتے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ صرف دنیا کے بنانے سے خدا کی الگ الگ صفتیں ہوتیں وہ منطقے اصلے سے دور ہیں ہیں برعکس اس کے انجیل کا یہ ایک اصول ہے کہ خدا[1] اپنے میں زندگی رکھتا ہے۔ اور وہ ہستی سے معمور ہے اور صفتوں کی بیقیاس دولت اپنے میں رکھتا ہے چنانچہ نازہی انزی گرے گوری نے خدا کو ہستی کا سمندر کہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نہ صرف خدا میں خود دانی نہایت کم ہوتی یعنے اُس میں تھوڑی ہی ایسی چیز ہوتی جس سے وہ واقف ہو سکتا بلکہ خدا خود مختار بھی نہ ہو سکتا کیونکہ جب اُس میں فرق نہیں ہے تو کس طرح ایک طرف سے باز رہ کر دوسری طرف مائل ہو سکتا ہے اور اگر وہ اپنے پر اختیار نہیں رکھتا تو کس طرح اَور کسی چیز پر اختیار رکھیگا ؎

آدمی کے لئے نہ صرف یہ ضرور ہے کہ وہ اپنی بہت سی صفات اور احوال میں اپنے تئیں ایک جانے بلکہ یہ بھی کہ وہ اپنے تئیں کیا روح کیا مادّہ سب چیزوں سے الگ جانے۔ خود دانی سے آدمی اپنے تئیں گویا غیر سے کھینچ لیتا ہے اور خود مختاری سے وہ اپنے تئیں گویا غیر میں داخل کر دیتا ہے تاکہ اپنے تئیں نہ صرف اُس سے الگ بلکہ اُس میں بھی

[1] یوحنا کے ۵: ۲۶ کو دیکھو ؎

کہے۔ لیکن یہ بات خدا پر صادق نہیں آسکتی ورنہ وہ کامل خود مختار نہ ہو سکتا اگر خدا کی شخصیت غیر پر موقوف ہے تو یہ لازم آتا ہے کہ دنیا کی پیدائش سے پہلے وہ بے شخصیت تھا۔ اگر کہیں کہ اُس نے اِس واسطے دُنیا کو پیدا کیا کہ اپنے تئیں اُس سے الگ جان کر پوری شخصیت حاصل کرے تو بغیر شخصیت کے کس طرح وہ کوئی ارادہ کر سکتا تھا۔ مگر پھر بھی یہ شک باقی رہتا ہے کہ خدا بغیر غیر کے خود دان شخص کس طرح ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آدمی میں تو یہ اس واسطے ممکن نہیں کہ وہ فی الحقیقت اکیلا نہیں ہے بلکہ اور چیزوں سے گھرا ہوا ہے اور اگر اور مخلوقات نہ ہوتی تو بھی اُس کا خالق ہوتا۔ لیکن خدا کا یہ حال نہیں ہے۔ خدا کی خود دانی میں بیحد خصوصیات ہیں جو ایک دوسرے سے الگ تو ہیں مگر ایک دوسرے سے بالکل متفق ہیں اور خدا کی غیر محدودی اسی طرح کی ہے۔ اگر دنیا مکان کے اعتبار سے بے حد ہوتی تو بھی فی الحقیقت غیر محدود نہ ہوتی کیونکہ اُس کی سب چیزیں ایک دوسرے کے مخالف ہیں یعنے جہاں ایک چیز ہے وہاں اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اگر خدا محض ایک سوتا تو غیر محدود نہ ہو سکتا کیونکہ دنیا سے محدود ہوتا لیکن چونکہ اُس میں بیحد خصوصیات ہیں وہ اپنے میں غیر محدودی رکھتا ہے اور دنیا کے ظاہر ہونے سے اس غیر محدودی میں خلل نہیں آیا۔ پس غیر کا وجود تمام شخصوں کے واسطے ضرور نہیں صرف مخلوق شخصوں کے واسطے ضرور ہے۔ خدا ازل سے ابد تک اپنے لئے بالکل کافی ہے +

پھر یہ شک پیدا ہوتا ہے کہ آیا خدا کی خود مختاری اُس کی خود دانی کا سبب ہے یا اُس کا نتیجہ ہے۔ یعنی کیا خدا اور اُس کی صفتیں بغیر کسی مرضی کے ہیں یہاں تک کہ جب خدا اپنے تئیں جانتا ہے اُسی وقت وہ مختلف ارادے اور کام کرتا ہے۔ یہ تو ہم لوگوں کا حال ہے اور

اسی واسطے ہم اپنے تئیں بالتمام کبھی نہیں جان سکتے کیونکہ ہم اپنی خودوانی سے پہلے موجود تھے۔ پھر اپنی مرضی سے نہیں بلکہ غیر کی مرضی سے۔ لیکن اگر خدا کا بھی یہی حال ہوتا تو کس طرح وہ "نوروں[عـه] کا باپ" ہوتا اور کیونکر اُس کی [عـه] اس کی عمیق چیزوں کو دریافت کر سکتی۔ اور پھر خدا کامل خودمختار کیونکر ہو سکتا؟

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا کو صرف غیر مخلوق کہنا کافی نہیں بلکہ اُس کو ازخود مخلوق بھی کہنا چاہئے۔ اس بات کو یونانی کلیسیا کے معلم لوگ آوٹ اوسیا یعنے ازخود ہستی کہتے تھے۔ یہ ازخود مخلوق کسی خاص وقت کی نہیں بلکہ ازلی و ابدی ہے۔ اسی بات کے ماننے سے خدا کی ہستی کی یہ دلیل ثابت ہوتی ہے کہ سب سببوں کا کوئی سبب چاہئے کیونکہ اگر خدا اپنا سبب نہ ہوتا تو اُس کا اور کوئی سبب ضرور ہوتا؟

پس خدا کی شخصیت آدمی کی شخصیت سے نہ صرف اس طرح جدا ہے کہ دونوں کی خودوانی ایک چیز کی دانش نہیں ہے بلکہ اس طرح بھی کہ دونو کی خودوانی جن چیزوں کی دانش ہے اُنکی اصل جُدا جُدا ہے۔ آدمی جو کچھ اپنے تئیں پہچانتا ہے اُسکی اصل صرف کسی قدر اُسمیں ہے۔ لیکن خدا جو کچھ اپنے تئیں پہچانتا ہے اُسکی اصل فقط وہی ہے اور کوئی نہیں۔ اسی سبب سے خدا کامل مختار ہے کہ وہ جو کچھ ہے سو اپنی ہی مرضی سے ہے۔ بلکہ علم ریاضی کے اُصول بھی جو خدا کی ذات وصفات کے اتحاد کی پرچھائیں ہیں خدا کی مرضی پر موقوف ہیں لیکن ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کبھی اُن کو بدل دے کیونکہ اس صورت میں ہم سے ہماری عقلوں کو بھی بدلنا پڑے گا۔ اگر سب سے پہلے پابندی ہوتی تو آزادی کبھی کامل نہ ہو سکتی لیکن اگر آزادی کو پہلے مانیں تو پابندی کی پیدائش کو سمجھ سکتے ہیں۔

[عـه] یعقوب کے خط کے ۱: ۱۷ کو دیکھو۔ [عـه] کرنتھیوں کے پہلے خط کے ۲: ۱۰ کو دیکھو؟

کیونکہ آزادی پابندی کو بھی پیدا کر سکتی ہے۔ اگر خدا اس طرح اپنا سبب نہ ہوتا یعنے اگر وہ اصل الاصول نہ ہوتا تو ہم نہ پوری تابعداری کے ساتھ اپنے تئیں اُس کے سپرد کر سکتے نہ آیندہ کے واسطے اُس پر پورا بھروسا رکھ سکتے۔ اگر وہ الف نہ ہوتا تو کیونکر ہم اُسے اومیگا[1] جان سکتے اور اگر یہ درست نہ ہوتا کہ "سب کچھ اُس سے ہے" تو کیونکر ہم جان سکتے کہ "سب کچھ اُس کے لئے ہے"[2]٭

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا کا غیر کو بنانا کسی طرح ضرور نہ تھا بلکہ صرف اُس کی مرضی سے ہوا جب خدا اپنی نسبت کامل خود مختار ہے تو غیر کی نسبت کیونکر نہ ہو۔ اور اُس کی یہ مرضی بھی کسی ضرورت سے نہیں ہوئی بلکہ محض محبت سے جس کے سبب اُس نے چاہا کہ میری سعادت میں اَور بھی شریک ہو۔ خلق کرنا کیا ہے؟ کامل خود مختاری سے کسی مقید چیز کو بنانا۔ پس خدا ہی سے ایسا کام ہو سکتا ہے خلقت کے فعل سے خدا جو اکیلا بھی رہ سکتا ہے محبت سے ایک غیر چیز اپنے میں سے بناتا ہے٭

لیکن اس سے یہ شک پیدا ہوتا ہے کہ جب محبت خدا کی ذات ہی میں ہے تو کیا محبت سے خلق کرنا ضرورت سے خلق کرنا نہیں ہے۔ اس کا کیا جواب ہوگا؟ کیا یہ اُس کی محبت بھی اُس کی مرضی پر موقوف ہے۔ یہ تو سچ ہے لیکن اگر اس حال میں یعنے جب کہ محبت اُس کی ذات میں ہے غیر کا خلق کرنا اُس محبت کے سبب ضروری ہے تو محبت کے پیدا کرنے سے خدا کی کامل خود مختاری جاتی رہی اور خدا غیر محتاج نہیں رہا٭

اس شک کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے یعنے تثلیث کا عقیدہ۔ مسیح یوحنا کے ١٧ باب ٢٤ میں خدا باپ سے کہتا ہے کہ "تو دنیا کی ابتدا سے مجھ سے محبت رکھتا تھا۔" اگر خدا ایک ہی شخص ہوتا تو خدا میں دنیا کے

[1] مکاشفہ کے ١ باب ٨ کو دیکھو [2] رومیوں کے خط کے ١١ باب ٣٦ کو دیکھو۔

Scanned by CamScanner

خلق کئے بغیر محبت ممکن نہ ہوتی کیونکہ محبت کے لئے دو شخص ضرور ہیں ایک محب دوسرا محبوب۔ پھر اگر خدا کی ذات ایک ہی نہ ہوتی یعنی اگر (نعوذ باللہ) دو یا تین خدا ہوتے تو ایک خدا دوسرے خدا کی محبت کا محتاج محتاج ہوتا یعنی خدا نہ رہتا۔ اِس واسطے کلام اللہ کے حق میں یوحنا کے اوّل میں دو تو بائیں لکھی ہوئی ہیں یعنی یہ کہ وہ خدا کے پاس تھا اور یہ کہ وہ خدا تھا۔ اگر تثلیث نہ ہوتی یعنے اگر خدا محبت کی نسبت بھی کامل خود مختار نہ ہوتا تو نہ صرف یہی ہوتا کہ وہ اپنے میں محبت نہ رہ سکتا بلکہ یہ بھی ہوتا کہ دنیا سے بھی کامل محبت نہ رکھ سکتا کیونکہ جہاں کچھ محتاجی ہے وہاں کامل محبت نہیں ہے۔ لیکن جب کہ خدا نہ صرف اپنی خود دان بلکہ محبت کی نسبت بھی اپنے لئے آپ بالکل کافی ہے تو خدا کی وہ کامل محبت جو مسیح کی انجیل میں بیان ہوئی ہماری سمجھ میں آسکتی ہے۔ یہ تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ خدا نے دُنیا کو اتفاقاً بنایا کیونکہ محبت کسی مقصد ہی کے سبب کام کرتی ہے لیکن یہ مقصد خالق میں نہیں یعنی اُس کو کچھ احتیاج نہ تھی بلکہ مخلوق میں ہے +

خدا نے اپنی محبت سے خلق تو بہت سی چیزیں کیں۔ لیکن سب میں سے شخصوں کی خلقت میں اُس کی محبت ظاہر ہوتی ہے۔ کیونکہ اشخاص سب مخلوقات سے زیادہ تر کامل ہیں اِس واسطے کہ وہ نہ صرف خدا کی مخلوق ہیں بلکہ کم و بیش خود مختار بھی ہیں۔ اِسی طرح وہ خدا کی مانند ہو سکتے ہیں اِسی طرح وہ اپنے تئیں خدا کو سونپ سکتے ہیں اور اسی طرح وہ اُس سے مقاربت رکھ سکتے ہیں۔ ضرور ہے کہ مخلوق شخص بھی کسی قدر خدا کی مانند از خود اور اپنا سبب ہو یعنے نہ صرف اُس کے افعال میں بلکہ اُس کی طبیعت میں بھی کسی قدر اُسی کا تعرف ہو۔ کسی قدیم اِس واسطے کہتے ہیں کہ اگر مطلق ایسا ہوتا تو آدمی خدا ہوتا۔ خدا نے آدمی کو خلق کرنے کے وقت ایک

خاص ذات یعنے انسانیت دی۔ یہ ذات تو آدمی کے قبضہ میں نہیں ہے لیکن اگر آدمی خدا کی محبت سے اور اپنے تئیں خدا کا تابعدار سمجھ کر خدا کی ٹھیرائی ہوئی قیود یعنے قاعدوں کو پسند کرتا تو وہ پھر اُس کو قیود نہ معلوم ہوتیں۔ اسی باب میں اور اسی قدر آدمی کامل خود مختار اور از خود ہے یعنی خدا کی محبت کے باب میں۔ وہ مخلوق ہو کر اس بات میں بالکل خود مختار ہے کہ چاہے خدا کی محبت کو پسند کرے چاہے اپنی خود غرضی کو۔ یہیں تک آدمی خدا کی مانند ہے اور یہیں تک وہ بالکل اُس کی صورت ہے ؛

عموماً خود مختاری میں تو گناہ کا امکان ضرور نہیں ہے۔ چنانچہ خدا کامل خود مختار ہے اور ہم گناہ کا امکان بھی اُس کی طرف منسوب نہیں کر سکتے یہ بات نہیں ہے کہ نیکی کی ضرورت خارج سے خدا کے لئے ثابت ہوئی ہے بلکہ صرف یہی ہے کہ ہماری دلی شریعت اور ساری خلقت اور وہ کلام جو ان دونوں کی گواہی پر مبنی ہے گواہی دیتے ہیں کہ وہ نیک ہے۔ پس اگر وہ (نعوذ باللہ) بد ہوتا تو ہم اور سب مخلوق فوراً نیست ہو جاتے ؛

لیکن آدمی کی خود مختاری میں گناہ کا امکان ہے۔ کیونکہ وہ اصل میں اپنے لئے نیکی نہ تھیرا سکا۔ نیکی اصل میں اُس میں نہیں ہے۔ بلکہ خدا ہی میں ہے اور آدمی صرف خدا ہی کے ساتھ علاقہ رکھکر نیک ہو سکتا ہے۔ پس چونکہ آدمی کی ذات از خود نیک نہیں ہے اس واسطے اُس میں نیکی اور بدی دونوں کا امکان ہے۔ ہاں خدا نے تو آدمی کو نیکی اور اپنی مقاربت کے لئے بنایا مگر وہ اپنی خود مختاری کے فعل یعنے اُس کو جو نیکی اور بدی دونوں میں سے جسے چاہے پسند کرنے کا اختیار ہے اُس کے بغیر ایسا نہیں ہو سکتا اور اس فعل میں گناہ کا بھی امکان رہا۔ اس خود مختاری کے فعل سے پیشتر آدمی خدا کا تابعدار تو تھا اور نہ مخلوق نہ ہوتا لیکن اس تابعداری میں نہ نیکی تھی نہ بدی بلکہ یہ صرف خواہ مخواہ تھی اور یہ بھی ہم نہیں کر سکتے کہ وہ

دو نو کے بیچ میں لٹک رہا تھا کیونکہ یہ بھی گناہ ہے۔ اگر خدا گناہ کے امکان کے دفع کرنے کے لئے شخص پیدا نہ کرتا یعنے آدمی میں خود دانی و خود مختاری نہ ہوتی تو نقصان تو کچھ نہ ہوتا مگر دنیا میں کوئی شے ایسی نہ ہوتی کہ اپنے تئیں اور اپنے خالق کو پہچان سکتی۔ جب خدا کا یہ مقصد تھا کہ دنیا میں پہچانا جائے تو یہ ہرگز ممکن نہ تھا کہ شخص پیدا نہ ہو +

پھر آدمی کی اس خود مختاری میں گناہ یعنے خود غرضی کا تخم نہیں ہے بلکہ یہ نیکی کے لئے بھی شرط ہے اگرچہ خود نیکی نہیں ہے۔ آدمی جب گنہگار ہوتا ہے تو اسی خود مختاری کے سبب وہ نہایت خراب ہو سکتا ہے کیونکہ اسی کے سبب وہ اپنے تئیں اپنا مقصد بنا سکتا ہے۔ آدمی اپنی خود مختاری کے سبب جتنا سرفراز تھا اتنا ہی اس کے بُرے استعمال سے خراب حال ہوا +

خدا نے آدمی کی خلقت اور سب کی خلقت سے جُدا رکھی ہے بلکہ ایک طرح سے آدمی کی خلقت کامل تر ہے کیونکہ اس کے خلق کرنے میں خدا نے اپنی خود مختاری سے ایسا کام کیا کہ جس سے اس کی خود مختاری آیندہ کو ایک طرح سے کچھ کم رہ گئی +

گناہ کا امکان خدا نے اس واسطے نہیں رکھا کہ وہ دائم رہے بلکہ اس واسطے کہ ہم گناہ کی مخالفت برابر کرتے رہنے سے آخر اس کے امکان کو موقوف کریں۔ بہت سے آدمیوں کا قول یہ ہے کہ ہر مخلوق کی حالت ضرور بدلتی رہتی ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے بلکہ حقیقی آزادی یہی ہے کہ گناہ کو بالکل ترک کر کے پھر اس کی طرف میل نہ کرے یعنی اس کا امکان پھر نہ رہے۔ لیکن اگر آدمی پہلے گناہ کے امکان سے واقف نہ ہوتا تو ہرگز اس حقیقی آزادی کو نہ پہنچ سکتا۔ اور سب قواعد جو خدا نے دنیا میں مقرر کئے ہیں ہماری خود مختاری پر جبر کرتے ہیں اور ہماری خود دانی سے کچھ علاقہ نہیں

رکھتے اور اُن کی اغراض خود بخود پوری ہوتی رہتی ہیں لیکن نیکی کا قاعدہ یعنی شریعت اُن کے برعکس ہے کہ وہ آدمی کی خودمختاری پر جبر نہیں کرتی بلکہ صرف اُس کی خودداانی ہی کے ساتھ رہتی ہے اور اس سبب سے شریعت کے ساتھ ہی اُس کی نافرمانی کے امکان کی واقفیت بھی ضرور ہوتی ہے۔ ورنہ جس طرح وہ قواعد مثلاً ہضم وغیرہ معلوم نہیں ہوتے اور اُن کی اغراض خود بخود پوری ہوتی رہتی ہیں۔ اسی طرح شریعت بھی معلوم نہ ہوتی۔ غرض جب تک آدمی شریعت سے واقف ہے یقین ہے کہ وہ خودمختار تو ہے مگر اب تک حقیقتاً آزاد نہیں اور جس وقت وہ بالکل شریعت کے مطابق ہو جائیگا اُس وقت وہ شریعت سے واقف نہیں رہے گا +

بعضوں کی رائے یہ ہے کہ گناہ کے امکان کی واقفیت بغیر گناہ کرنے کے ممکن نہیں۔ لیکن اگر امکان بغیر وقوع کے ممکن نہ ہوتا تو پھر امکان ہی نہ رہتا۔ گناہ کی ترقی کی حالت میں تو بہتیرے گناہ معلوم ہوتے ہیں اور آدمی کا حال بھی گناہ آلود ہو جاتا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ پہلا گناہ کوئی دانستہ فعل ہو۔ اور اس بُرے کام کی نسبت یہ خیال دل میں پیدا ہو کہ اسے نہیں کرنا چاہئے۔ اور پھر یہ بھی ضرور ہے کہ اُس بُرے کام کی نسبت یہ خیال بھی ہو کہ اُس کا کرنا مجھ سے ممکن ہے اور اگرچہ اب تک وہ بُرا کام ہوا نہیں لیکن اُس کا امکان صاف ظاہر ہے۔ اگر ان لوگوں کی رائے درست ہوتی تو مسیح بے گناہ نہ ٹھیر سکتا۔ اگر گناہ کی مخالفت کرنے کے واسطے ذرا بھی گناہ کرنا ضرور ہوتا تو یہ ذرا سا گناہ کرنا چونکہ بے گناہی سے ہٹنا ہے نہایت بڑا گناہ ہوتا اور مسیح نے جو اپنے تئیں بے گناہ اور گنہگاروں کی پناہ ٹھیرایا اس سے اُس کا یہ ذرا سا گناہ نہایت بڑا ہوتا۔ لیکن جب کہ گناہ کے امکان کی واقفیت بغیر گناہ

Scanned by CamScanner

کے ہو سکتی ہے تو اس سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ مسیح کا فی الحقیقت امتحان ہوتا تھا اور پھر بھی وہ بیگناہ رہا +

اِن باتوں کے ساتھ جو اس باب میں بیان ہوئیں ایک اور شک متعلق ہے۔ وہ یہ ہے کہ کیا گناہ بالکل ہماری سمجھ میں آسکتا ہے۔ یعنے کیا ہم نے اُس کا کوئی ایسا سبب نکالا ہے جس سے اُس کا پیدا ہونا صاف روشن ہو +

دنیا میں اگر کوئی سبب بالکل سمجھا جائے تو اُس کا نتیجہ بھی بالکل سمجھ میں آئیگا کیونکہ نتیجہ اپنے سبب یا سببوں سے خواہ مخواہ نکلتا ہے۔ مثلاً ہم گرہنوں کا بھید بخوبی سمجھتے ہیں۔ پس اگر گناہ اسی طرح خواہ مخواہ خود مختاری سے نکلتا تو وہ بھی سمجھ میں آتا لیکن اگر ایسا ہوتا تو پھر خود مختاری نہ رہتی۔ خود مختاری میں نہ نیکی کی طرف میلان ہے نہ بدی کی طرف اور نہ دونو کی طرف کیونکہ یہ کچھ میلان ہی نہ ہوتا۔ لیکن اگرچہ خود مختاری نیکی اور بدی دونو سے برابر علاقہ رکھتی ہے پھر بھی چونکہ وہ حقیقی آزادی کا رستہ نکلنے کے لئے خلق ہوئی ہے تاکہ اُس سے بدی نہیں بلکہ صرف نیکی ہی پیدا ہو اس واسطے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ نیکی اور بدی دونو بالکل ایک ہی طرح خود مختاری سے پیدا ہوتی ہیں بلکہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ نیکی کا پیدا ہونا سمجھا جاتا ہے اور بدی کا پیدا ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔ کیونکہ جب خود مختاری سے نیکی پیدا ہوتی ہے تو آدمی کے خلق ہونے کے مقصد کے موافق پیدا ہوتی ہے اور اس واسطے اُس کا پیدا ہونا معقول ہے لیکن جب خود مختاری سے بدی پیدا ہوتی ہے تو آدمی کے خلقت کے مقصد کے برخلاف بے غرض اور بے سبب پیدا ہوتی ہے کیونکہ آدمی کا خدا سے الگ اور اپنا ہی مقصد ہونا محض بے عقلی ہے پس بدی کا پیدا ہونا معقول

نہیں ہوتا۔ دنیا کے واقعات کے اسباب اُن سے پیشتر کی قوتیں ہیں مگر فعلوں کے اسباب اُن کی غرضیں ہیں جو اُن کے بعد وقوع میں آتی ہیں۔ اس واسطے جس طرح لوگ یہ کہتے ہیں کہ دنیا کا فلاں واقعہ مثلاً ہوا کا ایک دن شمال سے دوسرے دن جنوب سے چلنا سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ جن قوتوں سے یہ ہوتا ہے اُن سے ہم واقف نہیں۔ اسی طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ گناہ سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ اگرچہ ہر گناہ کسی نہ کسی غرض کے واسطے تو کیا جاتا ہے مگر پھر بھی کوئی غرض اُس کا کافی سبب نہیں ہے اس لئے کہ وہ آدمی کی خلقت کا مقصد نہیں ہے بلکہ اُس کے برخلاف ہے۔ ہاں ہر قسم کا گناہ ایک طرح سے تو سمجھا جاتا ہے یعنے وہ اصلی گناہ یعنے خود غرضی سے نکلتا ہے اور ہم دیکھ سکتے ہیں کہ وہ کس طرح اُس سے نکلتا ہے لیکن یہ اصلی گناہ خود بے سبب یعنی بے مطلب ہے اور اس واسطے سمجھ سے باہر ہے جب ہم اپنے یا دوسرے آدمی کے کسی عذر کے لئے اس کے سبب بتلاتے ہیں تو ہمیشہ اُن میں سے خاص سبب اپنی یا اُس کی طبیعت یا عادت پیش کرتے ہیں غرض ہم گناہ کا سبب گناہ ہی کو بتلاتے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ گناہ سمجھ سے باہر ہے اور دنیا کی تمام چیزوں میں وہی محض پوشیدہ اور تاریکی سے ڈھنکا ہوا ہے دنیا کے واقعات کی سمجھ تو علم اور تجربہ سے رفتہ رفتہ بڑھتی ہے مگر بدی کا بھید کبھی نہیں کھلتا بلکہ جتنا کوئی پاکی میں ترقی کرتا اور خدا سے مقاربت رکھتا ہے اُتنا ہی زیادہ گناہ محض بیعقلی کی بات اور بے مطلب معلوم ہوتا ہے

ہ اگرچہ ہم اس کا حال کچھ کچھ جانتے ہیں مثلاً یہ کہ سرد جگہ سے گرم جگہ کی طرف چلتی ہے لیکن چونکہ ہم یہ نہیں جانتے کہ ہر روز کون سی جگہ گرم ہے اور کون سی جگہ سرد اس واسطے یہ اس دقت کے سبب کا کافی بیان نہیں ہے۔

اور جب ہم کو جو اس میں پھنسے ہوئے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے تو خدا کو کیسا معلوم ہوتا ہوگا؟

چودھواں باب

خدا کی قدرت مطلق اور آدمی کی خودمختاری

اوپر کے باب میں جو کچھ ثابت ہوا اُس سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ کس طرح کوئی تابعدار مخلوق اپنی نیکی یا بدی کی بانی ہو سکتی ہے۔ لیکن جب خدا صرف خالق ہی نہیں بلکہ قادرِ مطلق بھی ہے تو کس طرح آدمی کی خودمختاری اُس کی قدرت کے ساتھ رہ سکتی ہے۔ اگر کہیں کہ خدا نے اپنی قدرت مطلق سے آدمی کو خودمختار بنایا تو اس سے یہ شک پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ کرکے خدا پھر قادرِ مطلق نہیں رہا +

قادرِ مطلق وہ ہے کہ جو کچھ وہ چاہے کر سکے اور جب اُس نے اپنے لئے نیک ذات اختیار کی تو ممکن نہیں ہے کہ وہ بدی کا بانی ہو۔ بہت سے لوگوں کی رائے یہ ہے کہ جو کچھ خدا کے امکان میں ہے اُس کو وہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن اگر ایسا ہو تو پھر آدمی کی خودمختاری کا نام ہی نام رہ جائے کیونکہ اُس کو کسی کام کے کرنے کی مجال نہ رہے بلکہ خدا ہی کی طرف سے سب کچھ ہو۔ اگر خدا کی قدرت دنیا کی قوتوں[1] کی مانند بے علم اور بیخود ہوتی۔ تو البتہ ویسا ہی ہوتا یعنے جو کچھ اُس کے امکان میں ہوتا وہ ضرور وقوع میں بھی آتا چنانچہ وہ قوتیں جب تک

[1] مثلاً کشش کی قوت جس سے ہر مادی شے اور سب اشیا کو اپنی طرف کھینچتی ہے لیکن اس قوت کا کچھ علم اُس شے کو حاصل نہیں ہوتا اور نہ اُس کے اختیار میں رہتی ہے +

دوسری قوتوں سے رُک نہیں جاتیں اپنے نتیجے خواہ مخواہ پیدا کرتی جاتی ہیں اور آپ سے آپ رُک نہیں سکتیں۔ لیکن خدا شخص ہے اور جو لوگ اُس کی بڑائی کے بڑھانے کے واسطے اُس کی شخصیت سے انکار کرتے ہیں وہ فی الحقیقت اُس کی بزرگی کو گھٹا دیتے ہیں۔ جو شخص ہے وہ اپنے تئیں روک سکتا ہے۔ ہاں مخلوق شخص اپنے فعلوں پر پورا اختیار نہیں رکھتا بلکہ اُس کے لئے خدا کی مرضی کو خواہ پسند کرنا خواہ رد کرنا یعنی اِن دونوں میں سے ایک نہ ایک ضرور ہے۔ لیکن جب خدا کامل خود مختار شخص ٹھہرا تو اُس کی طرف اِتنی ضرورت بھی منسوب نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس موقع پر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اگرچہ ضرورت تو نہیں مگر پھر بھی کیا یہ بہتر نہیں کہ جو کچھ خدا کے امکان میں ہو اُس میں سے وہ کچھ باقی نہ چھوڑے بلکہ اس کا کام بالکلیہ پورا ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں یہ بہتر نہیں ہے کیونکہ جب خدا اپنے میں کمال رکھتا ہے تو کچھ کم یا زیادہ کام کرنے سے اُس کمال میں کچھ فرق نہ ہوگا۔ جو کچھ خدا کرتا ہے وہ محبت ہی سے کرتا ہے اور یہ بھی اُس کے واسطے ضرور نہیں ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا +

یہ بھی ہم نہیں کہہ سکتے کہ جو کچھ خدا کے امکان میں ہے اُس میں سے اُس کو کچھ باقی چھوڑنا ضرور ہے۔ اس بات کا فیصلہ یعنی وہ کچھ باقی چھوڑتا ہے یا نہیں صرف اُن واقعات سے ہو سکتا ہے جو دُنیا کے تجربہ سے اور بائبل سے ہم کو معلوم ہوتے ہیں۔ جب خدا کا خاص کام یہ ٹھہرا کہ ایسی مخلوق پیدا کرے جو اپنی خود مختاری سے اُس کی طرف متوجہ ہو کر اُس کی پوری مقاربت رکھے تو اس سے بڑا کام کوئی ہماری سمجھ میں بھی نہیں آ سکتا تو بیشک ہم ایک طرح سے کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ خدا کر سکا سو اُس نے کیا لیکن یہ قول صرف خدا کے کام کے کمال سے نسبت رکھے گا۔

نہ اُن سارے کاموں سے جو اُس کے امکان میں ہیں یعنے اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ جتنے کام خدا کر سکا اُتنے اُس نے کئے بلکہ یہ ہوگا کہ جو اُس نے کیا ہے اُس سے کوئی بڑا کام وہ نہیں کر سکتا +

پس خدا کی قدرت مطلق کے واسطے یہ ضرور نہیں ہے کہ جو کچھ وہ پیدا کر سکے پیدا کرے اور اُس نے جو ایسا نہیں کیا اس سے اُس کی قدرت کچھ کم نہیں ٹھیرتی۔ لیکن البتہ جب اُس نے شخص پیدا کئے تو اُس نے اپنی قدرت میں کچھ خلل تو نہیں ڈالا مگر اُسے ظاہر ہونے سے کچھ روک رکھا۔ خدا نیک ہے اور نیکی کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا لیکن جب اُس نے شخص پیدا کئے جو صرف خود مختاری سے نیکی کر سکتے ہیں تو اُس کی مرضی جو اور سب مخلوقات سے خواہ مخواہ اپنا مقصد پورا کراتی ہے اُن شخصوں کی نسبت حکم کی صورت پکڑتی ہے جس کو وہ چاہیں تو پورا کر سکتے ہیں اور نہ چاہیں تو ٹال سکتے ہیں مگر یہ خدا کی محبت کے سبب ضرور تھا +

لیکن پھر بھی ہمیں نہیں چاہئے کہ بعضے معلموں کی طرح خدا کی ناکامیاب مرضی کا ذکر کریں کیونکہ یہ اُس کی قدرتِ مطلق کے برخلاف ہوگا۔ خدا کی جو مرضی شخصوں سے نسبت رکھتی ہے اُس میں دو باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ نہ صرف نیکی ہو بلکہ نیکی کی شریعت آدمی کو معلوم بھی ہو اور یہ بھی کہ نہ صرف گنہگار آدمی کی نجات کا کامل بندوبست مسیح سے ہو بلکہ سب آدمیوں کو کسی نہ کسی طرح سے معلوم بھی ہو جائے اور یہ مرضی ضرور پوری ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ نیکی صرف آدمی کی خود مختاری سے عمل میں آئے اور نجات اُس کو صرف اُس کی خود مختاری کے ذریعے سے ملے اور یہ مرضی بھی ضرور پوری ہوتی ہے۔ پس کسی طرح خدا کی مرضی ناکامیاب نہیں ہے +

اگر کوئی کہے کہ خدا کی قدرتِ مطلق کسی کو اپنے سے آزاد نہیں بنا سکتی تھی تو پھر وہ قدرت مطلق کہاں رہی خدا کے کاموں کا خاص سبب اُس کی قدرت نہیں بلکہ اُس کی محبت ہے۔ پس جب کہ وہ ازل سے ابد تک اپنے مقصود کو یعنی اس بات کو کہ خود مختار شخص اُس سے پوری مقاربت رکھیں دیکھتا ہے تو اس مقصود کے پورا ہونے کے لئے جو کچھ ضرور ہے وہ محبت سے اُس کی برداشت کرتا ہے مثلاً اپنی خود مختاری کو کسی قدر کم کرنا اور گناہ ہونے دینا جیسا کہ پچھلے باب میں مذکور ہوا +

بعض معلّموں نے خدا کی نسبت اجازت سے انکار کیا اور کہا کہ اگر خدا گناہ کرنے کی اجازت دیتا ہے تو وہ اُس کا بانی ٹھیرا۔ البتہ اس طرح سے خدا گناہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ گناہ کی کچھ پروا نہ کرے اور گویا یہ کہے کہ چاہو تو گناہ کرو مگر اِس اجازت سے مراد یہی ہے کہ وہ گنہگار کو گناہ کرنے سے جبراً نہیں روکتا۔ اور یہ ضرور ہے کیونکہ جہاں حکم ہے وہاں حکم کے ٹالنے کی اجازت ضرور ہے یعنی اُس کی نافرمانی سے نہ روکنا ورنہ حکم دینا نہ ہوتا بلکہ خود کام کرنا ہوتا۔ ہاں رضامندی سے تو خدا گناہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا ورنہ وہ اُس کا جوابدہ ہوتا۔ لیکن وہ فقط اُس کی برداشت کر لیتا ہے۔ اور خدا جو ہر ایک آدمی کو ہر ایک گناہ کرنے دیتا ہے تو اُس گناہ کے ظہور کی حد باندھ دیتا ہے یہاں تک کہ خدا کا مقصود اگرچہ اُس سے رُک جاتا ہے مگر پھر بھی آخر کار ضرور پورا ہوگا +

پندرھواں باب

خدا کا علم مطلق اور آدمی کی خود مختاری

ایک شک اور رہا ہے یعنے خدا کے علم مطلق کے ساتھ آدمی کی خود مختاری کس طرح رہ سکتی ہے۔ کیونکہ جب آدمی خود مختار ٹھیرا تو اس سے ثابت ہے کہ جو کچھ اُسنے اختیار کیا اُس کے عوض اور کچھ بھی اختیار کر سکتا تھا۔ لیکن اگر خدا پہلے سے جانتا تھا کہ آدمی کس کو اختیار کرے گا تو آدمی وہی اختیار کر سکتا ہے جس کا خدا کو علم تھا۔ یہ دو نتیجے آپس میں صاف ضد ہیں +

سُوشن کے پیرو جو آجکل اکثر یونے ثیرین کہلاتے ہیں اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ خدا آدمی کی خود مختاری کے افعال پہلے سے جانتا ہے۔ لیکن یہ رائے بالکل خدا کے کمال کے برخلاف ہے۔ خدا کی پیش بینی علم مطلق سے ہوتی ہے نہ کہ قیاس سے ورنہ اگرچہ خدا کروڑوں دفعہ درست قیاس کرتا پھر بھی کبھی نہ کبھی غلطی ہوتی۔ اسواسطے شک مذکور کا یہ جواب کہ اگرچہ ہم نے پیشتر سے جانا ہو کہ فلاں آدمی فلاں حالت میں کیا کرے گا پھر بھی اُس کا فعل ہماری پیش دانی پر موقوف نہیں ہے پختہ جواب نہیں کیونکہ ہماری یہ پیش دانی فقط قیاس ہے۔ مگر پھر بھی ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ ایک آدمی کا فعل دوسرے آدمی کے قیاس پر ہرگز موقوف نہیں ہے تو غالباً خدا کے علم مطلق پر بھی موقوف نہ ہوگا کیونکہ آدمی میں کتنی ہی پیش دانی کیوں نہ ہو پھر بھی واقعہ کچھ اُسپر موقوف نہ ہوگا۔ پس جب پیش دانی مطلق ہوئی تو اِس صورت میں بھی ظاہراً واقعہ اُس پر کچھ موقوف نہ ہوگا +

اکثر معلموں نے اس شک کا یہ جواب دیا ہے کہ فی الحقیقت خدا کی پیش دانی نہیں ہے بلکہ صرف علم مطلق ہے یعنے اُس کی نسبت نہ ماضی ہے نہ مستقبل بلکہ وہ ازل سے ابد تک سب واقعات حال ہی میں دیکھتا ہے لیکن کیا خدا کی ازلیت و ابدیت سے یہ لازم آتا ہے کہ اُس کے علم میں ماضی اور حال اور استقبال کا فرق یعنے زمانہ کی روانی کی واقفیت نہیں ہے۔ ہرگز نہیں۔ ہاں جس طرح ہم لوگوں کو یہ فرق اور یہ روانی معلوم ہوتی ہے اُسی طرح تو خدا کے علم میں معلوم نہیں ہو سکتی۔ لیکن زمانہ نہ صرف ہمارے علم کے لئے ایک ضروری ظرف ہے (یعنے ہم لوگ خواہ مخواہ جو کچھ جانتے یا سوچتے ہیں کہ ماضی یا حال یا استقبال میں جانتے یا سوچتے ہیں) بلکہ تمام مخلوقات کی ہستی کے لئے ایک ظرف ہے جیسا کہ مکان اُس کا ایک دوسرا ظرف ہے یعنے اِن دونوں کے بغیر مخلوقات رہ نہیں سکتی اس سبب سے اگر ہم اقرار کرتے ہیں کہ خدا مخلوقات کو جانتا ہے تو یہ بھی اقرار کرنا ہوگا کہ ماپا کے بس ہو کر نہیں بلکہ جیسی وہ ہے ویسی ہی وہ اُسے جانتا ہے یعنے زمانہ کا پابند۔ خدا کی خود دانی میں تو زمانہ نہیں ہے یعنے وہ اپنے تئیں ہمیشہ صرف حال ہی میں دیکھتا ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُس کے اُس علم میں جو وہ دُنیا کی نسبت رکھتا ہے زمانہ نہیں ہے۔ اگر خدا دُنیا کو زمانہ کا پابند نہ دیکھتا تو وہ اُس کو ویسا یعنے زمانہ کا پابند خلق بھی نہ کر سکتا جیسا خدا ساری مخلوقات کو مکان کا پابند دیکھتا ہے لیکن نہ وہ اور نہ اُس کا علم مکان کا پابند ہے بلکہ اُس سے بے نہایت زیادہ ہے ویسا ہی وہ ساری دنیا کو زمانہ کا بھی پابند دیکھتا ہے لیکن نہ وہ اور نہ اُس کا علم زمانہ کا پابند ہے بلکہ اُس سے بے نہایت زیادہ ہے۔ وہ ازل سے ابد تک ہر ایک واقعہ کو اُس کے خاص وقت میں دیکھتا ہے وہ آگے کی بات کو آگے اور پیچھے کی بات کو پیچھے ہمیشہ دیکھتا ہے۔ اِن باتوں سے یہ صاف

پانچواں حصّہ گناہ کی تاثیر

سولھواں باب

آدمی کسقدر گنہگار ہے

یہ تو ہم ثابت کر چکے ہیں کہ گناہ کا اصل سبب کیا ہے یعنی آدمی کی خود مختاری پس اب یہی دریافت کرنا باقی ہے کہ گناہ نے اس اصل سے پیدا ہو کر آدمیت میں کتنی اور کیسی تاثیر کی ہے۔ اس باب میں ہم دو باتوں کو ثابت کرنے کی کوشش کرینگے ایک یہ کہ کوئی آدمی اس دنیا میں سراسر گنہگار نہیں ہے دوسرے یہ کہ سب آدمی اس دنیا میں گنہگار ہیں +

ا۔ بہت سے معلموں نے کہا ہے کہ خدا کے خاص فضل کے ہونے سے پیشتر یعنی جب تک مسیح کی روح اپنی تاثیر نہیں کرنے لگتی آدمی میں مطلق نیکی نہیں رہتی۔ لیکن اس رائے کے برخلاف یہ دلیلیں ہیں +

ا۔ یہ تو سچ ہے کہ آدمی آپ سے آپ خدا کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا لیکن اگر اس میں خدا کے فضل کے قبول کرنے کی قوت نہ ہوتی تو آدمی کے اس فضل کے رد کرنے کا عیب خدا ہی پر لگتا۔ اور اگر خدا کا فضل قبول کرنے کی قوت ہے تو خدا کی طرف کچھ نہ کچھ میلان بھی ہوگا کیونکہ بے سبب تو ہم کچھ قبول نہیں کر سکتے۔ اور جب خدا کا فضل آدمی کے پاس آتا ہے تو وہ اپنی خود مختاری سے اس میلان کو یا عمل میں لا سکتا ہے یا دبا سکتا ہے۔ مقدس کتاب میں وہ آدمی جو نوشتہ نہ ہو اگرچہ مُردہ کہلاتا ہے مگر پھر خفتہ اور بیمار بھی کہلاتا ہے اور ایک آیت میں یعنے افسیوں کے خط کے ۵: ۱۴ میں ایسے آدمی کو مُردہ اور

خط دونوں سے تشبیہ دی گئی +

۲- یہ صحیح ہے کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جن میں خدا کی محبت کچھ اثر نہیں کرتی مگر اُن کی بھی تمیز اور نیکی کی خواہش اُن میں بہت تاثیر کرتی ہے۔ ایسے لوگ خدا کی شریعت کے تابعدار تو نہیں ہیں لیکن اکثر اُس شریعت پر عمل کرنا اُنہیں پسند آتا ہے اور کبھی کبھی خودغرضی کے بالکل برخلاف کام کرتے ہیں۔ اعمال کے ۱۰: ۳۵+ رومیوں کے خط کے ۲: ۱۰ و ۱۴ اور ۲۶+ لوقا کے ۱۰: ۳۴ و ۳۵ کو دیکھو +

۳- جو لوگ شریر سے شریر ہیں وہ بھی کبھی کبھی بڑی شرارت کے کاموں سے اگرچہ ایک لمحہ کے واسطے ہو متنفر ہوتے ہیں اس سے صاف ثابت ہے کہ وہ بدی کی انتہا تک نہیں پہنچے ہیں یعنے اُن میں کچھ نہ کچھ نیکی ہے +

۴- یہی بات اس بےچینی سے بھی ثابت ہے جو مسیح کے فضل سے ناواقف لوگوں کے دلوں میں ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ رومیوں کے خط کے ۷: ۱۴ سے لے کر ۲۵ تک ایسے ہی آدمی کا بیان ہے جس کے دل میں خدا کی شریعت کی تاثیر تو ہے اور اُس پر عمل کرنے کی خواہش بھی ہے مگر وہ آدمی گناہ کے زور سے گویا قیدی رہتا ہے کیونکہ اُس کو مسیح کی رُوح نے رہائی نہیں بخشی۔ چونکہ خدا سے اُس کا میل نہیں ہوا اس واسطے ایسا آدمی اپنے سے بھی میل نہیں رکھ سکتا۔ یشعیاہ ۵۷: ۲۰ و ۲۱- کو دیکھو۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ جوانی یا دولتمندی یا خاص مزاج کے سبب یہ بےچینی پوشیدہ رہے مگر کبھی نہ کبھی موقع پاکر وہ ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس بےچینی سے جو خدا کی غیر منطقی خواہش

Scanned by CamScanner

کے سبب پیدا ہوتی ہے یہ نتیجہ تو کبھی نہیں پیدا ہو سکتا کہ آدمی خدا کو پسند اور شریعت پر عمل کرنے لگے مگر ہاں یہ نتیجہ ہو سکتا ہے کہ اِس بے چینی کے سبب آدمی مسیح کی نجات کو قبول کرے۔ اور جب ایسا نہیں ہوتا تو خود خدا دانی اور شرع دانی ہی سے اپنی نیکی پر فخر کرنے کا نتیجہ جو سب سے زیادہ خراب حال ہے پیدا ہوتا ہے +

۲۔ اب ہم دوسری بات ثابت کرتے ہیں یعنے یہ کہ سب آدمی اِس دنیا میں گنہگار رہیں۔ یہ تو صحیح ہے کہ گنہگار کئی درجے کے ہوتے ہیں۔ لیکن کیا کوئی بالکل بیگناہ بھی ہے؟ اس سوال کے ہم یہ جواب دیتے ہیں +

۱۔ جتنا کوئی نیک ہے اُتنا ہی زیادہ وہ اپنے تئیں گنہگار جانتا ہے کیونکہ جب وہ گناہ کرتا ہے تو اتنا ہی زیادہ تمیز کے برخلاف کام کرتا ہے۔ اکثر لوگوں کی تمیز سُست اور گویا نیند سے بھری ہوئی ہے لیکن جب کوئی نیکی کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اُس کی تمیز اپنا کام کرنا شروع کرتی ہے اور جو گناہ پیشتر نادانستہ کئے جاتے تھے وہی گناہ اب تمیز کی روشنی سے دیدہ و دانستہ کئے جاتے ہیں +

۲۔ یہ بڑے تعجب کی بات تو ہے کہ ایسا کوئی نہیں ملتا جس نے بالغ ہو کر اپنی تمیز کے برخلاف یعنے دیدہ و دانستہ بھی گناہ نہ کیا ہو مگر سچ ہے۔ پس اگر ہم صرف اُن ہی گناہوں کو گناہ سمجھتے جو دیدہ و دانستہ کئے جائیں تو بھی اِس سے سب آدمیوں کی گنہگاری ثابت ہوتی +

۳۔ کوئی از خود اپنی ناچاری نہیں سمجھ سکتا بلکہ اگر کچھ نیک ہونا چاہتا ہے تو سمجھتا ہے کہ میں آپ سے آپ نیک ہو سکتا ہوں۔ اس کا سبب آدمی کی بے پایاں خود غرضی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ آدمی کسی کسی بات میں نیکی پیدا کر سکتا ہے مگر پھر بھی وہ خود خود غرضی کا

ظاہر رہتا ہے ÷

۴- یوروپ میں ایک مثل مشہور ہے کہ ”ہر ایک آدمی کی کم و بیش قیمت ہے“ اور ”ہر ایک آدمی میں ایک کمزور جگہ ہے“ یعنے کوئی آدمی ایسا نیک نہیں ہے کہ اگر کوئی خاص موقع یا امتحان پیش آئے تو وہ بدی میں نہ پھنسے۔ یہ بات بالکل تجربہ کے مطابق ہے۔ ایک شخص نے خوب کہا ہے کہ ”ایسے تو بہت سے ہیں جن کا کوئی گناہ بے دیکھے یقین نہیں کرنا چاہئے لیکن ایسا کوئی نہیں ہے جس کو گناہ کرتے دیکھ کر تعجب کرنا چاہئے“ اگر کسی کو اس بات میں شک ہو تو وہ خیال کرے کہ اگر والدین اور اَور سب لوگ جن کی صحبت یا تعلیم سے میرے لڑکپن کی عادت میں تاثیر ہوئی خراب ہوتے تو میں اب کیسا ہوتا۔ یا اپنا پچھلا حال سوچے جب کہ بڑی خرابی کا بیج جو اُس کے دل میں ظاہر ہوا تھا خراب چال چلن کا پھل لانے سے اُس کی نیکی کے سبب نہیں بلکہ صرف اتفاقاً یعنے خدا کے فضل سے رُک گیا تھا ÷

۵- جو عقیدے گناہ کے اقرار کے مخالف ہیں یعنے برہمو سماج اور [ط] ویدانت اِسمے اُن سے بھی سب کی گنہگاری ثابت ہو سکتی ہے۔ برہمو سماج گناہ کی حقیقت سے تو انکار کرتا ہے یعنے اُسے ضروری سمجھتا ہے لیکن جسے ہم گناہ کہتے ہیں اُس سے وہ انکار نہیں کرتا اور نہ اس بات سے انکار کرتا ہے کہ اُس میں اور نیکی میں رات دن کا فرق ہے۔ پس چونکہ وہ اُسے گناہ نہیں کہتا اِس واسطے یہ کہنا کہ سب آدمی اس میں مبتلا ہیں اُس کو بُرا نہیں لگتا ÷

ط۔ برہمو سماج والے یہ کہتے ہیں کہ ایک خدا تو ہے جس کی صفات نیک۔ راست۔ رحیم وغیرہ ہیں مگر آدمی بہت خراب نہیں ہے اِس واسطے کسی درمیانی یا نجات دہندہ کی ضرورت نہیں ÷

وے اسما بڑے اور چھوٹے گناہوں کے فرق پر بہت لحاظ کرتا ہے وہ صریحی گناہوں سے جو بعضے آدمیوں سے ہوتے ہیں بڑی نفرت رکھتا ہے اور اُن کے لئے آدمی کو قصوروار ٹھیراتا ہے مگر چھوٹے گناہوں کو جو سب آدمیوں سے ہوتے ہیں کمزوریاں کہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ آدمی کی ناتمامی سے خواہ مخواہ ہوتے ہیں اور ان میں اُس کی کچھ قصورواری نہیں لیکن اگر ایسا ہوتا تو یہ کمزوریاں شریعت کے مطابق ہوتیں اور وہ نیکی جو اُن سے آزاد ہو شریعت سے بڑھ کر ہوتی - اس کے علاوہ یہ بات ہے کہ جس چیز کا سبب دریافت کرنا ہے اُسی سے وے اسما انکار کرتا ہے یعنے اِسی عجیب اور افسوسناک امر کا سبب دریافت کرنے کے قابل ہے کہ چھوٹے گناہ سب آدمیوں میں پائے جاتے ہیں اور وے اسما ان کی نسبت یہ کہتا ہے کہ چونکہ یہ چھوٹے گناہ سب آدمیوں میں پائے جاتے ہیں اس سبب سے گناہ نہیں ہیں - لیکن اس جواب کی کیا دلیل ہے اور اس سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے - اور پھر صریحی اور چھوٹے گناہوں کی حد کون باندھ سکیگا - کون اِس طرح کسی کو گنہگار اور کسی کو بیگناہ ٹھیرا سکیگا - صریحی گناہ اِسی واسطے ہم کو گناہ معلوم ہوتے ہیں کہ ہم اکثر اُنہیں نہیں کرتے لیکن جو انہیں کرتا ہے وہ اِس حد کو اور آگے بڑھا دیتا ہے یعنے جن گناہوں کو ہم صریحی سمجھتے ہیں اُن میں سے بعض کو وہ چھوٹے گناہوں میں شامل کر لیتا ہے - غرض کوئی آدمی اپنے گناہوں کو صریحی گناہوں میں شمار نہیں کرتا - لیکن اگر کوئی بالکل بیگناہ آدمی ہم میں ہوتا تو کیا وہ ہماری ساری بے الفتی ریاکاری بے صبری سستی غرض جن جن چیزوں کو ہم کمزوری کہتے ہیں اُن سب کو دیکھ کر متنفر نہ ہوتا - اگر گناہ گناہ ہے تو خدا کی مرضی کے برخلاف ایک انگلی اُٹھانی بھی گناہ ہے - یہ کمزوریاں ہیں تو سب میں جیسا کہ وہ اس سے بھی اقرار کرتے ہیں مگر اس قول کا یہی مطلب ہے کہ سب خدا کی شریعت

سے برگشتہ ہیں۔ اس واسطے جو سب کو کمزور مانتا ہے اُسے سب کو گنہگار
اور قصوروار بھی ماننا ہوگا ÷

۷ صاف ظاہر ہے کہ مقدس کتاب میں بھی اس بات کی گواہی پائی
جاتی ہے کہ سب آدمی گنہگار ہیں۔ عہدنامۂ عتیق میں سلاطین کی پہلی کتاب
کے ۸: ۴۶۔ اور زبور کے ۱۴۳: ۲۔ اور امثال کے ۲۰: ۹۔ اور واعظ کے
۷: ۲۰۔ میں یہ صاف لکھا ہوا ہے۔ عہدنامۂ جدید میں پولس رومیوں کے
خط کے ۳: ۹ و ۱۹ و ۲۰ و ۲۳۔ اور ۵: ۱۲۔ اور گلتیون کے خط کے ۳: ۲۲
میں یہ بات فرماتا ہے اور یوحنا اُنہیں جو مسیحی بھی ہو کر اپنے تئیں بے گناہ
سمجھتے ہیں خود فریب کہتا ہے۔ اور اس کے علاوہ نئی پیدائش کی ضرورت
جو سب کے لئے بیان ہوئی۔ گناہوں کی مغفرت کی خبر جو سب کو پہنچانے کا
حکم ہوا۔ مسیح کی نجات کا جو بیان ہوا کہ وہ سب آدمیوں کے لئے ضرور ہے
اور تیار بھی ہے۔ ان باتوں سے وہ عقیدہ ثابت ہے۔ اور نیز اس سے
بھی ثابت ہے کہ یوحنا بپتسما کہتا ہے کہ "جو مسیح پر ایمان نہیں لاتا خدا کا
قہر اس پر قائم ہے" یعنے مسیح کی خبر پانے سے پیشتر بھی خدا کا قہر اُس پر تھا۔
اور نیز مسیح اپنے شاگردوں کو بھی بُرا کہتا ہے[۲]

ان سب دلیلوں کے جواب میں بعضے لوگ اعمال کے ۱۰: ۳۵ و لوقا
متی کے ۹: ۱۲ و ۱۳ کو پیش کرتے ہیں۔ ہاں اِن میں سے دوسرے
مقام میں بعضوں کا ایسا ذکر تو ہے کہ "توبہ کے حاجتمند نہیں" لیکن قرینہ
سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ فریسی تھے اور یہ کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ مسیح
فریسیوں کو فی الحقیقت بیگناہ جانتا تھا اور پہلے مقام کے قرینہ سے
ظاہر ہوتا ہے کہ پیشتر کرنیلیس کو بیگناہ نہیں سمجھتا تھا ورنہ کیوں وہ فوراً

[۱] یوحنا کے ۳: ۳۶ کو دیکھو ÷ [۲] لوقا کے ۱۱: ۱۳ کو دیکھو ÷

گناہوں کی مغفرت کی منادی کر کے اُسے بپتسمہ دلواتا۔ البتہ عزیز علی راستبازی کا بھوکا تھا اور اس سبب سے وہ متوجہ خدا کی طرف تھا اور اُس کے افعال خدا کی مدد سے ہوئے تھے اور وہ اُس کے بیٹے کی بادشاہت میں شامل ہونے کے واسطے "مقبول" تھا تاکہ اپنے گناہوں کی مغفرت حاصل کرے۔

سترھواں باب

گناہ آدمی کی طبعی خرابی ہے

جب یہ ٹھہرا کہ سب آدمی گنہگار ہیں تو اب یہ ثابت کرنا ہوگا کہ سب آدمیوں کا گناہ اُن کی طبعی خرابی ہے یعنی آدمی کی ذات تو خدا کے ہاتھ سے بیگناہ بنی مگر پھر بھی ہر ایک آدمی جب سے پیدا ہوا اس وقت سے گنہگار ہی ہے۔

یہ تو تھوڑی سی غور کرنے سے بھی صاف ظاہر ہے کہ آدمی سے متفرق بُرے افعال جو صادر ہوتے ہیں گناہ اُن سے کچھ زیادہ ہے یعنی وہ اُس کے دل کا ایک بُرا میلان یا کئی بُرے میلان ملے ہوئے ہیں۔ تو کیا ہم اس گناہ کو اپنی نیکیوں سے جدا کر کے اُسے اکیلا سوچ سکتے ہیں؟ ہاں خیال میں تو ایسا جدا کرنا نہ صرف ممکن بلکہ ضرور ہے یعنی نیکی اور گناہ دونو کو الگ الگ چیزیں خیال کرنا ضرور ہے۔ لیکن کیا ہم فی الحقیقت اپنی نیکی اور اپنے گناہ کو جدا جدا سوچ سکتے ہیں؟ نہیں بلکہ ایسا کرنے کی ہم جتنی زیادہ کوشش کرتے ہیں اُتنا ہی مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اگر ہم یہ سمجھ بھی لیں کہ ہم نے اپنی نیکیوں کو اپنی بدیوں سے بالکل جدا کر لیا ہے تو

لہ یوحنا ۱: ۴۷ کو دیکھو۔ ملہ یوحنا ۳: ۲۲ کو دیکھو۔

بھی جب ہم اُن نیکیوں کو دیکھینگے تو یقیناً اُن میں کچھ نہ کچھ بدی پائینگے۔ اور یہ بار بار ہوتا رہیگا۔ یہانتک کہ یہ اُمید منقطع کر دینی ہوگی کہ ہماری کوئی نیکی نری نیکی پائی جائیگی اور یہ ماننا ہوگا کہ ہم میں گناہ کی ایک جڑ لگی ہوئی ہے جس کی شاخیں کم و بیش ہمارے سب افعال اور ہمارے دل کی ساری حالتوں کے ساتھ اُلجھی ہوئی ہیں۔ بلکہ اگرچہ کسی وقت ہم اپنے میں کوئی بدی نہ دیکھ سکیں پھر بھی ہم اُس وقت اپنے تئیں بیگناہ نہ ٹھیرا سکیں گے کیونکہ گناہ کا ایک خاصہ یہ ہے کہ وہ ہم کو اندھا کر دیتا ہے اور اس سبب سے وہ کم پہچانا جاتا ہے۔ پھر جو لوگ پاکیزگی کے حاصل کرنے میں کوشش کرتے ہیں اُن سے یہ بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ جتنی اُن کی نیکیاں ہیں سب نادانستہ بگڑ کر بدیاں ہو جاتی ہیں۔ مثلاً جو سرگرم ہونا چاہتا ہے وہ سخت ہو جاتا ہے اور جو حلیم ہونا چاہتا ہے وہ گناہ کا تحمل کرنے لگتا ہے اور جو خوف ہونا چاہتا ہے وہ گھبرانا کرنے لگتا ہے اور جو ہوشیار ہونا چاہتا ہے وہ بزدل اور فکرمند ہو جاتا ہے۔ جب ہم اپنے میں نیکیوں کے بیج بوئیں تو خواہ مخواہ کڑوے دانے بھی اُن کے ساتھ جم کر اُگینگے۔ اور نیز جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ نیک لوگ بھی کبھی طرفداری سے بالکل آزاد نہیں ہیں بلکہ کم و بیش اپنے ہی حال کو نیک ٹھیرا کر اوروں کے حال میں جو بات اُن کے حال کے خلاف ہے اُس کو بد ٹھیراتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنی نیکی کو اپنی بدیوں سے الگ کر کے اُس کو خالص نہیں پا سکیں گے +

اچھا پھر یہ کہو کہ ہمارا یہ گناہ آلود حال کس طرح ہو گیا؟ مگر یہ کوئی اپنے تجربہ سے نہیں کہہ سکتا۔ کسی کو ایسا وقت یاد نہیں جس میں وہ پاک سے ناپاک ہوا اور نہ ہم لڑکوں میں ایسی دفعتاً تبدیل دیکھتے ہیں۔ جب لڑکا پہلے پہل شریعت سے واقف ہوتا ہے اُس وقت وہ اپنے تئیں

اُس شریعت کا مخالف جان لیتا ہے بلکہ اکثر اس مخالفت ہی کے سبب وہ شریعت کو پہلے پہل پہچانتا ہے۔ یہ تو سچ ہے کہ ہر آدمی کی زندگی میں کسی نہ کسی وقت اُس کا پہلا گناہ ہونا ضرور ہے لیکن اُس پہلے گناہ سے لڑکے کا حال دفعتہً نہیں بدلتا اور نہ اُس میں ایسا زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ جیسا اُس صورت میں ضرور ہوتا جب کہ وہ آگے بیگناہ ہوتا بلکہ غور سے دیکھنے والوں پر ظاہر ہوتا ہے کہ یہ گناہ کی ابتدا نہیں صرف اس کا ظہور ہے۔ البتہ لڑکے بالغوں کی نسبت معصوم ہیں کیونکہ اُن میں گناہ نے اتنا زور نہیں پکڑا ہے جتنا اِن میں اور اسی واسطے مسیح نے فرمایا کہ چاہئے کہ میرے سب شاگرد لڑکوں کی مانند ہوں۔ لیکن سب لڑکوں کا بھی یہ حال نہیں ہے بلکہ بعضوں سے نہایت بچپنے میں بھی بڑی کینہ اور فریب ڈراؤنے طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ اور نیز اگر لڑکے ابتدائے پیدائش سے گنہگار نہ ہوتے بلکہ صرف بدنمونے اور بُری تعلیم سے خراب ہو جاتے تو اس کا کیا سبب ہوتا کہ جنہوں نے بُرا نمونہ کبھی نہیں دیکھا اور نہ بد تعلیم کبھی پائی اُن میں سے بھی بہت سے لڑکے نہایت خراب نکلتے ہیں۔ ہم یہ تو ثابت کر چکے ہیں کہ آدمی کا گناہ اُس کے مجسم ہونے پر موقوف نہیں ہو سکتا بلکہ اگر ہوتا تو بھی روح کا جسم کے تابعدار ہونا اُس کا گناہ ہوتا اور اس گناہ کا سبب پھر ڈھونڈنا پڑتا۔ پس جب آدمی لے لڑکپن کی بیگناہی ثابت نہیں ہو سکتی تو یہ اقرار کرنا ضرور ہے کہ آدمی اپنی ابتدائے پیدائش سے گنہگار ہے +

اس کے علاوہ اِس عقیدے کی اور بھی دلیلیں ہیں +

۱- اس کا کیا سبب ہے کہ جس کسی آدمی سے ہم ملتے ہیں اُس کو گنہگار سمجھتے ہیں اور اگرچہ اُس کی طرف کوئی خاص گناہ منسوب نہیں کرنا چاہتے پھر بھی ہم اُس سے ہمیشہ ایسا ہی سلوک کرتے ہیں کہ گویا ممکن ہے کہ ہم اُس سے یا اُس کی نسبت دھوکا کھائیں بلکہ اگر کوئی

آدمی ہم سے اپنے تئیں بے گناہ بیان کرے تو فوراً اسی سبب سے اُسے
زیادہ تر بُرا سمجھیں گے بشرطیکہ اُس کا ظاہری چال چلن بالکل اُس
دعوے کے مطابق نہ ہو۔ اس کا ایک بڑا سبب تجربہ ہے اور اسی واسطے
چھوٹا لڑکا اپنے والدین اور اَور بزرگوں کو گنہگار سمجھتا ہے لیکن یہ بڑا
یقین بالکلیہ ہمارے تھوڑے تجربہ پر موقوف نہیں ہو سکتا بلکہ معلوم
ہوتا ہے کہ آدمی ازخود اپنی طبیعت کو گناہ آلودہ جانتا ہے اور اسی سبب
سے اَوروں کو بھی ویسا ہی سمجھتا ہے ÷

۲- پھر یہ خیال کریں کہ نیکی کرنی ہمیشہ مشکل اور بدی کرنی ہمیشہ
آسان ہوتی ہے۔ اگر بدی کی ترقی چاہیں تو صرف اُس کو بڑھنے دینا
کافی ہے لیکن اگر ہم نیکی کی ترقی چاہیں تو بے انتہا تکلیف مشقت
اور لڑائی کرنی پڑے گی اگر گناہ آدمی کی طبعی خرابی نہ ہوتی تو کیوں
ایسا ہوتا۔ پھر نہ صرف شخص واحد میں بلکہ خاص کر دنیا میں یہ حال
دیکھا جاتا ہے۔ اگر کوئی بُرا خیال یا دستور جاری کرنا چاہے تو کیسا
آسان ہوگا۔ لیکن اگر وہ کوئی عمدہ خیال یا دستور جاری کرنا چاہے
تو کتنی اُس کی مخالفت کی جائیگی یہاں تک کہ اگر اُسے اپنا سارا آرام و دولت
بلکہ اپنی زندگی بھی کھونی ہو تو کچھ تعجب نہ ہوگا۔ مسیح نے اگرچہ خود مختار
ہو کر اپنے تئیں موت کے حوالہ کیا لیکن اگر ہم اُس کی موت پر دوسری
طرح سے غور کریں تو وہ ایک ضروری بات معلوم ہوگی یعنے چونکہ اُس نے
اس دنیا میں کامل پاکی قائم کرنے کا قصد کیا اس لئے اُس کو مرنا پڑا۔
پھر یہ بھی خیال کرنا چاہئے کہ جس لڑکے کو بُری تعلیم اور بد نمونہ ملتا ہے
وہ ہمیشہ خراب ہوتا ہے لیکن جس کو نیک نمونہ اور اچھی تعلیم ملتی ہے وہ
ہمیشہ نیک نہیں نکلتا ÷

۳- آدمی کی طبعی خرابی کا اس سے بڑھ کر کوئی پختہ ثبوت نہیں

Scanned by CamScanner

ہو سکتا کہ نوزادوں میں بھی گناہ بڑا زور کرتا ہے۔ اُن کو ہمیشہ بڑی کوشش اور سخت لڑائی کرنی پڑتی ہے کہ مبادا خدا کی محبت جو اُن میں پیدا ہوئی ہے گھٹ جائے اور خود غرضی جو اُن میں مغلوب ہوتی ہے پھر غالب ہو جائے بلکہ وہ گویا از خود جانتے ہیں کہ اس زندگی میں ہم بے گناہ نہ ہونگے۔ لیکن اگر گناہ اس زندگی میں شروع ہوتا تو کس واسطے یہ اُمید نہ ہو سکتی کہ اِسی زندگی میں وہ ختم بھی ہو جائیگا۔

۴۔ مقدس کتاب نہ صرف اُن عہدوں سے جن میں سب آدمیوں کی گنہگاری مذکور ہے اس عقیدہ کی طرف اشارہ کرتی ہے بلکہ اِن خاص آیتوں سے بھی اِس پر صاف گواہی دیتی ہے۔

۱۔ زبور کے ۵۱: ۵ "دیکھ میں نے بُرائی میں صورت پکڑی اور گناہ کے ساتھ میری ماں نے مجھے پیٹ میں لیا" اس میں شک نہیں کہ جو بات داؤد نے یہاں اپنے حق میں کہی وہ صرف یا خاص کر اُسی پر صادق نہیں آتی بلکہ علی العموم سب پر صادق آتی ہے اور بعضوں نے جو اِس کے یہ معنی سمجھے ہیں کہ بچوں کا جننا جنانا ہی گناہ میں شامل ہے یہ صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ ایک تو یہ عہدنامۂ عتیق کے عقیدوں کے بالکل برخلاف ہے اور دوسرے جب داؤد کا یہی مطلب تھا کہ اپنے گناہ کی بُرائی بیان کرے تو کس طرح وہ اُس کا ایسا بیان کر سکتا تھا جس سے اُس کی گنہگاری بہت کم ہو جاتی۔ پس اس بات کے یہی معنی ہوں گے کہ آدمی پیٹ میں پڑنے ہی سے لے کر گناہ میں مبتلا رہتا ہے خصوصاً اِس واسطے کہ چھٹی آیت میں داؤد یہ اقرار کرتا ہے کہ "خدا اندر ہی کی سچائی چاہتا ہے" اور یہ دعا مانگتا ہے کہ "باطن میں مجھے دانش سکھلا"۔

۲۔ ایوب کے ۱۴: ۴ "کون پاک کو ناپاک سے نکال سکتا ہے؟

کوئی نہیں"۔

۳- پیدائش کے ۸: ۲۱ "آدمی کے دل کا تصور لڑکپن ہی سے بالکل بُرا ہے"۔

۴- کرنتھیوں کے پہلے خط کے ۷: ۱۴ "ورنہ تمہارے لڑکے ناپاک ہوتے لیکن اب پاک ہیں"۔ اگر مسیحیوں کے لڑکوں کے لئے اُن کے والدین ہی کے سبب ایک طرح کا تقدس ہے تو اَوروں کے لڑکے جنمی ناپاک ہیں۔

۵- افسیوں کے خط کے ۲: ۳ "ہم طبیعت سے اَوروں کی مانند غضب کے فرزند تھے"۔ طبیعت سے وہ اس لئے کہتا ہے کہ یہودی لوگ خدا کے فضل سے اُس کے رحم کے فرزند ہو گئے تھے لیکن اُن کی بھی طبیعت غیر قوموں کی طبیعت کے برابر تھی۔ اس آیت سے نہ صرف آدمی کی طبعی گنہگاری بلکہ اُس کی طبعی قصورواری بھی ثابت ہے یعنے یہ گنہگاری صرف کمزوری یا بدنصیبی نہیں بلکہ فی الحقیقت گناہ ہے ورنہ خدا کا غضب اُس پر نہ ہو سکتا۔

۶- یہ عقیدہ مسیح کے کنواری سے پیدا ہونے سے بھی ثابت ہے۔ اگر آدمی پیدائش ہی سے بلکہ پیٹ میں پڑنے ہی سے لیکر ناپاک نہ ہوتا تو کیا ضرور ہوتا کہ مسیح معجزہ سے پیدا ہوا۔ وہ کیوں دستور کے موافق پیدا ہو کر اپنے تئیں بے گناہ نہ رکھ سکتا۔ اسی سبب سے لوقا کے ۱: ۳۵ میں فرشتہ اس کی نسبت کہتا ہے کہ "وہ پیدا ہونے والا قدوس"۔

۵- پھر یہ خیال کریں کہ یہ طبعی خرابی کیا ہے؟ اصل میں یہ خود غرضی ہے جیسا کہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ گناہ کی حقیقت خودغرضی ہے۔ جو لڑکے سب سے اچھے ہیں اُن کے چال چلن میں بھی اَوروں کے ساتھ برتاؤ کے وقت کم و بیش خودغرضی معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ بات اِس سے اَور

Scanned by CamScanner

زیادہ صاف معلوم ہو جائیگی کہ اگرچہ آدمی اپنی ذات سے خدادان اور خدا کا خواہشمند ہے مگر پھر بھی خدادانی اور خدا کی خواہش دونو سب آدمیوں میں ابتدا ہی سے دبی رہتی ہیں اور اُن کی عوض خدا سے بے فکری خدا کی حقارت یعنی ناامیدی - خدا سے نخفتہ اور عداوت رکھنی دل پر غالب آئی ہے خدا سے حقارت رکھنی بالکل ہماری ذات کے اصلی حال کے مطابق ہے لیکن کیسی نہایت مشکل ہے - کتنا اپنے دل سے لڑ لڑ کر اِس حقارت کو رکھنا ہوتا ہے - اور دینداری جو ہمارے سارے کاموں اور خیالوں میں مؤثر ہونی چاہئے اپنی تاثیر سے کتنی دور ہے - یہ تو کچھ ضرور نہیں کہ ہماری جسمانی اور دُنیاوی خواہشیں کچھ کمزور ہو جائیں بلکہ وہ جتنی طاقتور رہیں اتنا اچھا ہوگا مگر خدا کی محبت اور اُس کی شریعت کی تابعدار رہیں - اُن کا زور آدمی کی خرابی کا باعث نہیں ہے لیکن اُن کا خدا کی محبت اور اُس کی شریعت کا تابعدار نہ رہنا آدمی کا گناہ ہے کیونکہ آدمی خود یعنی اُس کی رُوح خدا اور اُس کی شریعت سے برگشتہ ہوئی اور یہی اُس کی خرابی کا باعث ہے - اِس سبب سے کہ آدمی کی خدادانی کمزور اور ناچار ہو گئی دو طرح کے نتیجے نکل سکتے ہیں ایک تو یہ کہ کبھی کبھی آدمی اپنی گنہگاری اور برگشتگی سے واقف ہو کر خدا سے ڈرنے لگتا ہے یہاں تک کہ اُس کی نسبت غور کرنے بلکہ اُس کا ذکر سننے کو بھی ناپسند کرتا ہے اور یہ خصوصاً اُن مقاموں میں ہوتا ہے جہاں خدا کا سچا علم انجیل کے وسیلہ سے بہت پھیلا ہوا ہے - دوسرے یہ کہ کبھی کبھی آدمی کی خدادانی خود اُس کی نفسانی خواہشوں کی تابعدار ہو کر اِس امر کا باعث ہوتی ہے کہ وہ اِن خواہشوں کو بے کھٹکے اور دین کی اجازت اور رضامندی سمجھ کر پورا کرنے لگتا ہے اور یہ غیر مذہب والوں کا وہ حال ہے جس میں بنی اسرائیل بار بار مبتلا ہوتے تھے ٭

۶ - اِن سب دلیلوں کے علاوہ آدمی کی طبعی گنہگاری کی ایک اور

Scanned by CamScanner

بڑی دلیل ہے یعنے موت اِس پر اگر کوئی یہ کہے کہ پھر حیوان کیوں مرتے ہیں تو اس کا یہ جواب ہے کہ حیوانوں کی موت کچھ تعجب کی بات نہیں کیونکہ اُن میں سے ہر ایک صرف اپنی جنس کا ایک نمونہ اور مظہر ہے اور جیسے اُس کے وجود کی ابتدا ہوئی ویسے ہی اُس کا ختم ہونا بھی عجب نہیں لیکن آدمی جو شخص ہے۔ آدمی جو خود مختار فرد ہے اور صرف اپنی جنس کا نمونہ نہیں ہے۔ آدمی جو خدا دان ہے اور ازلی و ابدی باتوں کا خیال کر سکتا ہے وہ کس طرح مر سکتا ہے۔ اگر کہیں کہ آدمی نہیں مرتا یعنے اُس کی رُوح نہیں مرتی بلکہ موت کے سبب اُس کی مخلصی ہوتی ہے تو موت جتنی کم تعجب کی باعث ہوئی اُتنی ہی زیادہ پیدائش تعجب کی بات ہوئی یعنے اگر جسم سے الگ رہنا آدمی کے لئے مجتمع رہنے سے بہتر ہے تو اُس کی پیدائش کیوں ہوئی۔ مسیحی دین کا تو ایک خاص عقیدہ یہ ہے کہ خدا نے آدمی کو مجتمع خلق کیا اور اُس کے کمال کے واسطے جسم ضرور ہے یعنے جب تک اُس کا جسم پھر جی نہ اُٹھیگا اُس وقت تک اُس کا کمال نہ ہوگا۔ پس کیوں آدمی کا جسم رفتہ رفتہ اُس کی رُوح سے مغلوب ہو کر ایسے کمال تک نہیں پہنچتا کہ کھانا پینا وغیرہ ضرور نہ ہو بلکہ وہ بالکل رُوح کا تابعدار اور گویا اُس کا آلہ ہو جائے؟ کیوں ضرور ہے کہ بیچ میں یہ موت آجائے جو اکثر بڑے دُکھ کے ساتھ ہوتی ہے اور ہمیشہ رُوح اور جسم کے مدت تک جُدا جُدا رہنے کا باعث ہے؟ کیونکہ پہلے جسم کا سڑنا اور رُوح کا اُس سے برہنہ ہونا اور پیچھے قیامت ہونی ضرور ہے؟ اس سوال کا جواب بائبل تو یہی دیتی ہے کہ آدمی گنہگار ہے اور کیا عقل کوئی اور جواب دے سکتی ہے؟ نہیں۔ رومیوں کے خط کے ۵: ۱۲۔ اور کرنتھیوں کے پہلے خط کے ۱۵: ۲۱۔ و ۲۲ کو دیکھو۔ رومیوں کے خط کے ۸: ۱۰ میں صاف لکھا ہے کہ تو نادے جس کی رُوح راستبازی کے سبب زندہ ہے اُن کا بدن بھی گناہ کے سبب

مُردہ یعنے مرنے والا ہے۔ اور پیدائش کے ۲: ۱۷ میں خدا نے جو آدم سے کہا کہ "جس دن تو اس پھل کو کھائیگا مر جائیگا"۔ اِس میں اگرچہ شاید روحانی موت کی طرف بھی اشارہ ہے تو بھی خصوصاً جسمانی موت کا اس میں ذکر ہے پیدائش کے ۳: ۱۹ کو بھی دیکھو۔ اور زبور کے ۹۰: ۷ و ۹ و ۱۱۔ اور گنتی کے ۱۶: ۲۹ و ۳۰۔ اور شاید گنتی کے ۲۷: ۳ سے بھی یہی بات ثابت ہے +

مگر پھر بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آدمی کا جسم گناہ ہی کے سبب فانی ہے کیونکہ آدمی کا جسم تو ایسا ہی فانی بنایا گیا ہے جیسا کہ اَور جانداروں کا لیکن ہاں اگر وہ گنہگار نہ ہوتا تو اُس کی یہ فنا پذیری خدا دفع کر دیتا۔ آدمی کا جسم جس حال میں کہ خدا کے ہاتھ سے پیدا ہوا اُس میں موت کا امکان تو تھا مگر اُس کی ضرورت گناہ ہی کے سبب ہو گئی۔ خدا نے آدم کے گناہ ہی کے سبب اُس سے کہا کہ "تو پھر خاک میں مل جائیگا"۔ اور پھر خدا نے یہ بھی فرمایا کہ "تو خاک ہے تو پھر زمین میں مل جائیگا جس سے تو لیا گیا ہے"۔ پیدائش کے ۳: ۲۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آدم و حوا نے گناہ کیا ہے اُس وقت تک اُنہوں نے درخت حیات کا پھل نہیں کھایا تھا اور اگر وہ اُس کو کھا لیتے تو اُن کا جسم غیر فانی ہو جاتا +

معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کا بدن بھی رفتہ رفتہ ہی غیر فانی ہوا۔ یہ غیر فنا پذیری اُس کے مرنے سے پہلے تو پوشیدہ طور پر ترقی کرتی تھی اور جب اُس کی صورت بدل گئی اُس وقت ایک گھڑی کے واسطے ظاہر ہوئی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے جی اُٹھنے سے بھی فنا پذیری رفتہ جاتی نہیں رہی بلکہ صرف یہ ہوا کہ غیر فنا پذیری اُس پر غالب آگئی یہانتک کہ وہ پھر نہیں مر سکا۔ چنانچہ اُس نے کھایا پیا اور پانچوں زخم اُس کے جسم میں موجود تھے۔ لیکن صعود کے وقت اُس کی فنا پذیری بالکل جاتی رہی

اور وہ بالکل غیر فانی ہو گیا۔ پس مسیح کی موت اُس کی ذات کے واسطے ضرور نہیں تھی کیونکہ وہ بیگناہ تھا بلکہ اُس نے اپنی ہی خوشی سے اُسے اختیار کیا۔

جب یہ ثابت ہو چکا کہ موت گناہ کے سبب ہوتی ہے تو پھر ہم پوچھتے ہیں کہ وہ کس گناہ کے سبب ہوتی ہے؟ اس زندگی کے بُرے افعال کے سبب سے تو نہیں ہوتی کیونکہ آدمی اِس سے پہلے کہ گناہ کرنے کے قابل ہو بلکہ پیدا ہونے سے بھی پہلے مر سکتا ہے پس معلوم ہوا کہ آدمی کی طبعی گنہگاری ہی اُس کا سبب ہوگا اور چونکہ سب آدمی مرتے ہیں اسواسطے یہ طبعی گنہگاری سب میں ہوگی۔ اسی طرح سے رسول فرماتا ہے کہ "ایک آدمی کے سبب گناہ دنیا میں آیا اور گناہ کے وسیلہ سے موت اور اسی طرح موت سب پر پھیل گئی کیونکہ سب نے گناہ کیا"۔ یعنی سب لوگ نہ صرف اپنی طبعی گنہگاری کے سبب موت کے محکوم ہوئے بلکہ اپنے اپنے بُرے اعمال کے سبب بھی اُس کے مستوجب ہوئے۔

اٹھارھواں باب

موروثی برائیاں

جیسا کہ ہم گیارھویں باب میں ذکر کر چکے ہیں ہر ایک آدمی کی ایک جبلی طبیعت ہے جو اُس کے فعلوں یا خود مختاری پر موقوف نہیں ہے۔ یہ طبیعت کچھ تو اُس کی خاص طبیعت ہے کچھ اُس کے خاندان کی کچھ اُس کی قوم کی (اور خاندانوں اور قوموں کے بے شمار درجے ہیں) اور کچھ تمام بنی آدم کی۔ اِس میں شک نہیں کہ یہ طبیعت موروثی ہے یعنی والدین کے وسیلے سے ہر ایک کو پہنچتی ہے۔ اکثر تو والدین ہی کی خاص صفتیں اُن کی اولاد سے ظاہر ہوتی ہیں لیکن کبھی کبھی ماں باپ کی نہیں بلکہ دادوں اور نانوں یا ان سے بھی پیشتر کے بزرگوں کی صفتیں ظاہر ہوتی ہیں اور کبھی

ایسی صفتیں بھی جو خاص اُن ہی کی ہیں مگر پھر بھی والدین ہی اِن صفات کے ناواقف پہنچانے کے وسیلے ہوتے ہیں۔ خدا اپنی مرضی کے موافق ہر ایک آدمی کو کُل صفات انسانی میں سے وہ صفتیں دیتا ہے (خواہ اُس کے والدین یا خاندان یا قوم سے ظاہر ہوئی تھیں خواہ نہیں) جن سے وہ وہی کام اِس دُنیا میں کرے جس کے واسطے خدا نے اُس کو پیدا کیا ہے اور اِس طرح خدا دنیا کے قواعد سے آزاد ہو کر اس دنیا میں اپنی مرضی پوری کرتا ہے اور اپنی بادشاہت کو ترقی دیتا ہے +

غرض یہ سب صفتیں خواہ عام ہوں یا خاص جس وقت کہ نطفہ رحم میں قرار پکڑتا ہے اُسی وقت آدمی کو پہنچتی ہیں اگرچہ حمل کے تمام زمانہ میں بچہ کی زندگی اُس کی ماں کی زندگی پر موقوف رہتی ہے مگر پھر بھی وہ اُس سے علیحدہ ہے اور ماں کی طبیعت میں سے صرف اُسی چیز کو جو اُس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے اپنے سے ملا لیتا ہے اور باقی سب کچھ رد کرتا ہے کیونکہ اُس کی طبیعت اُسی وقت بن چکی جس وقت اُس کا نطفہ رحم میں ٹھہرا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ لڑکوں کا جسم اور مزاج جتنا ماؤں سے مناسبت رکھتا ہے اُتنا ہی باپوں سے بھی رکھتا ہے +

پھر جس طرح صفتیں موروثی ہوتی ہیں اُسی طرح عیب بھی موروثی ہوتے ہیں۔ اور نہ صرف بعضے جسمانی مرض بلکہ مختلف بدیوں کے میلان بھی موروثی ہوتے ہیں۔ جس کے والدین میخوار یا شہوت پرست یا تند مزاج تھے اُس سے ان بدیوں کے میلان ظاہر ہوں گے۔ پھر اگر وہ ان میلانوں کا بخوبی مقابلہ نہ کرے تو اُس کے والدین سے بھی زیادہ اُس میں زور پکڑینگے اور اگر اُن کو اُن کے سبب اس دنیا میں کچھ سزا نہیں بھی ملتی تو اُن کی اولاد کو ضرور ملیگی۔ اسی سبب سے خدا نے توریت میں وہی کہا جو روزمرہ ہمارے سامنے بھی واقع ہوتا ہے کہ میں باپ اداؤں

کی بدیوں کی سزا تیسری چوتھی پشت کی اولاد کو جو مجھ سے کینہ رکھتے ہیں دیتا ہوں۔" اور مسیح نے اپنے ہمعصر یہودیوں سے فرمایا کہ "ہابیل کے خون سے لے کر جتنے بے قصوروں کا خون زمین پر بہایا گیا سب اس قوم کے سر پر آئے گا۔" اور یہ بُرے میلان بھی کبھی کبھی بیٹے بیٹیوں سے نہیں بلکہ پوتوں اور نواسوں سے ظاہر ہوتے ہیں +

یہ تو ہرگز ہمارا مطلب نہیں ہے کہ مباشرت میں کچھ گناہ ہے یا وہ گناہ کا نتیجہ ہے۔ لیکن وہ علاقہ جو خدا نے آدمی کی غیر فانی رُوح اور اسکے اس کثیف جسم کے درمیان رکھا ہے اور جس میں ہر طرح گناہ کے حملوں سے خاص خطرہ ہے اُس سے خاص کر مرد اور عورت کی صحبت میں زیادہ تر خطرہ ہے کیونکہ دو رُوحوں کی محبت اور دو شخصوں کی جسمانی خواہش یہ دونوں اسی کام میں اور سب کاموں سے زیادہ ظہور میں آتی ہیں اور اسی واسطے آدمی کی طبعی خرابی کے سبب اکثر روحانی محبت جسمانی خواہش سے مغلوب ہوتی ہے بلکہ اُس کی تابعدار اور گویا اُس کا آلہ ہو جاتی ہے لیکن یہ خدا کی مرضی نہیں تھی بلکہ اب بھی ممکن ہے کہ مباشرت کا کام خاص روحانی اور نہایت ہی پاک کام ہو اور اُس کے وسیلے سے اچھی صفتیں بچوں کو پہنچائی جائیں مگر ہاں یہ ممکن نہیں ہے کہ کئی پشت تک والدین کے پاک ہونے سے رفتہ رفتہ یہ موروثی بُرا میلان بالکل دفع ہو جائے کیونکہ کوئی شخص اس بُرے میلان سے بالکل آزاد نہیں ہے بلکہ اگر یہ مغلوب بھی ہو جائے تو بھی اس کا معدوم ہونا ممکن نہیں پس ضرور ہے کہ آدمی اپنی نیکیوں کے ساتھ اپنا بُرا میلان بھی اپنی اولاد کو پہنچائیگا +

جب خدا نے آدم اور حوا کو برکت دے کر کہا کہ "پھلو اور بڑھو" اُس وقت وہ بیگناہ تھے۔ لیکن جب سے آدمی بگڑ گیا اُس وقت سے بُرے میلان اُسی مباشرت سے جو بیگناہی کے وقت مقرر ہوئی تھی پہنچانے جاتے ہیں۔

اِسی سبب سے ضرور تھا کہ مسیح جو بنی آدم میں شمار ہونے کے واسطے عورت سے پیدا ہونے والا تھا مرد کے مباشر ہونے سے پیدا نہ ہو ورنہ خواہ مخواہ بُرے میلان اُس سے ظاہر ہوتے جب تک وہ مریم کے پیٹ میں رہا اُس کی صفتوں میں سے صرف وہی اپنے سے ملا رکھا جو اس سے مناسبت رکھتی تھیں +

اس بُرے میلان کا اول سبب آدم اور حوا کا گناہ تھا جب تک اُنھوں نے ممنوع میوہ نہیں کھایا تھا اُسوقت تک یہ بُرا میلان اُن میں موجود نہ تھا۔ اُس وقت آدمی کی ساری قوتیں اور خواہشیں ایک دوسرے سے میل رکھتی تھیں اور جسمانی خواہشیں روحانی خواہشوں کی تابعداری کرتی تھیں اور روحانی خواہشیں خدا کی تابعداری کرتی تھیں۔ اور چونکہ روح میں کمال صحت تھی اس واسطے اُن کے بدن میں بھی ویسی ہی صحت تھی اور اگر آدمی کا حال اُسی طرح رہتا تو نہ کبھی بیمار ہوتا اور نہ مرتا بلکہ آخر اُس کا بدن مجلّٰے ہو جاتا لیکن گناہ کے سبب یہ سب باتیں بدل گئیں اور وہ خرابی جو آدم اور حوا کے گناہ کے سبب مختلف قوموں اور خاندانوں اور افراد انسانی میں موجود ہے اگرچہ جدا جدا ہے خاصکر اسی بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ جسم رُوح کے اختیار میں نہیں رہتا۔

یہ موروثی بُرا میلان مباشرت کے سبب بڑھ سکتا ہے اور اسی وجہ سے یہ دیکھا جاتا ہے کہ بعضی قوم ساری کی ساری جسمانی خرابی میں پشت در پشت زیادہ تر پھنستی جاتی ہے یہانتک کہ تقریباً کل میت ہو جاتی ہے۔ مگر ہاں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ قوموں اور خاندانوں کے خاص بُرے میلان کبھی نہ کبھی مدہم ہو جاتے ہیں ورنہ تمام بنی آدم کی خرابی پشت در پشت زیادہ ہوتی جاتی اور یہ تجربہ کے برخلاف ہے لیکن آدمیت کے سب عام بُرے میلان جو آدم کے گناہ کے سبب ہوئے

ہر ایک آدمی میں پائے جاتے ہیں +

اُنیسواں باب

طبعی گنہگاری اور موروثی بُرا میلان

اوپر ہم دو باتیں ثابت کر چکے ہیں ایک تو یہ کہ آدمی میں گنہگاری طبعی ہے جو ابتدائے پیدائش سے اُس میں موجود رہتی ہے۔ دوسرے یہ کہ آدمی میں بُرا میلان موروثی ہے جس سے اُس کے بہت سے نقصان ہوتے ہیں اور خاص کر یہ کہ جسم رُوح کی تابعداری میں نہیں رہتا۔ اب یہ کہنا باقی ہے کہ یہ دونو باتیں ایک ہی نہیں ہیں کیونکہ طبعی گنہگاری رُوح کی خرابی ہے جو خود مختاری سے پیدا ہوئی۔ اور یہ بُرا میلان جسم یا نفس کی بدحالی ہے جو ہمارے اختیار سے نہیں ہوئی اگرچہ ہم اب کم و بیش اُس پر اختیار رکھتے ہیں۔ غرض دونوں حقیقت گناہ ہے اور یہ اگرچہ آدم و حوا کے گناہ کے سبب ہوا اور اُن کے بعد والدین کے سبب بڑھ بھی سکتا ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں پھر بھی گناہ نہیں ہے بلکہ بدحالی ہے۔

آدمیوں کی رُوحوں کی پیدائش کی نسبت کلیسیا میں مختلف رائیں پیش ہوئی ہیں۔ بعضوں نے تو یہ سمجھا ہے کہ خالی جسم ہی والدین سے پیدا ہوتا ہے اور باقی سب کچھ خدا کی طرف سے نیا خلق ہوتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف یہ بات ہے کہ جیسا ہم اوپر کے باب میں کہہ چکے ہیں آدمیوں کی بہت صفتیں اور عیب اُن کے والدین یا خاندان یا قوم سے ملتے ہیں اور بہت سی صفتیں اور عیب تمام بنی آدم میں عام ہیں۔ اور بعضوں کی یہ رائے ہے کہ آدمی بالکلیہ رُوح اور جسم سمیت صرف والدین

سے پیدا ہوتا ہے اور خدا کی نئی خلقت کچھ نہیں ہوتی۔ لیکن اِس کے برخلاف یہ بات ہے جیسا کہ ہم بہت دفعہ کہہ بھی چکے ہیں کہ ہر رُوح واحد اور سب رُوحوں سے علیحدہ ہے اور یہی بات خدا کی صورت کی خاصیت ہے +

اِس امر کی نسبت درست عقیدہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ رُوح مباشرت کے وقت خدا کی طرف سے خلق ہوتی ہے اور والدین سے کچھ علاقہ نہیں رکھتی اور خالی جسم نہیں بلکہ نفس بھی یعنی وہ اَن دیکھی چیز جو جسم کے ساتھ ہی رہتی ہے اور جس کے وسیلے سے جسم رُوح پر تاثیر کرتا ہے جسم کے ساتھ والدین سے پیدا ہوتا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ روحانی خرابی جو آدمی کا گناہ ہے اور جس کو کوئی آدمی دوسرے سے حاصل نہیں کر سکتا اُس نفسانی بُرے میلان سے جو فی الحقیقت گناہ نہیں ہے اور موروثی ہوتا ہے بالکل علیحدہ ہے +

اِس عقیدے کے برخلاف دو رائیں ہیں جنہوں نے کلیسیا میں بہت رواج پایا ہے یعنی بعضوں نے اُس روحانی طبعی خرابی کو موروثی گناہ کہا ہے اور بعضوں نے اُس کو نہ موروثی ٹھیرایا ہے اور نہ گناہ یہ دونو اِس بات میں تو ہمارے ساتھ متفق ہیں کہ جہاں فی الحقیقت گناہ ہے وہاں قصورواری بھی ہے اور اِس واسطے پہلی رائے والوں نے تو یہ سمجھا ہے کہ موروثی خرابی کے گناہ ہونے ہی سے اُس کے سبب قصورواری بھی ہوگی اور دوسری رائے والوں نے یہ سمجھا ہے کہ اسی سبب سے کہ قصورواری موروثی نہیں ہو سکتی وہ روحانی طبعی خرابی گناہ نہیں ہوگی۔ پہلی رائے کے طرفدار خصوصاً اگستین کے پیرو ہیں۔ اور دوسری رائے کے طرفدار خصوصاً آرمنی کے پیرو ہیں۔ اب ہم اِن دونوں کا جواب دیتے ہیں ؞

۱۔ اگستینی لوگ یہ خیال کریں کہ ہم میں جو خرابی ہم سے نہیں بلکہ دوسرے آدمی کے سبب ہوئی اُس کے واسطے ہم قصوروار نہیں ٹھیر سکتے۔ اور اِس واسطے جب کہ یہ خرابی ہمارے سب عملی گناہوں کا سبب ہے تو ہم

اپنے کسی عملی گناہ کے لئے بھی بالکل قصوروار نہیں ٹھہرینگے ۔ پس جب ہم اِس طبعی گناہ کے سبب قصوروار نہیں ٹھہر سکتے تو یہ گناہ گناہ کیونکر رہیگا لیکن وہ گناہ تو ہے جیسا کہ ہم ثابت کر چکے ہیں اور جب گناہ ہے تو اُس کے ساتھ قصورواری بھی ہوگی مگر بات یہ ہے کہ وہ گناہ موروثی نہیں ہو سکتا ۔

اس رائے کی ایک دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ بنی آدم ایک ہی جنس اور ایک ہی جماعت کے ہیں اور ممکن نہیں کہ کوئی فرد بشر اور افراد سے الگ رہے ۔ ہزاروں طرح سے ہر ایک کو بہت سے آدمیوں سے اثر پہنچتا ہے اور خصوصاً اپنے والدین اور آبا و اجداد اور بزرگوں سے ۔ پس کیا تعجب ہے کہ گناہ بھی آدم سے اُس کی ساری اولاد میں پھیلا ہوا ہے اگرچہ ہر ایک آدمی اپنے گناہ کو اپنا ہی سمجھتا ہے ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر گناہ صرف ایک طرح کی بدحالی یا گویا بیماری ہوتی تو یہ دلیل مقبول ہو سکتی لیکن ہمارا سوال تو یہ ہے کہ کس طرح آدمی اپنے طبعی گناہ کے واسطے جوابدہ ہے ؟ جہاں جوابدہی کا ذکر ہے وہاں جنس اور جماعت کا لحاظ کرنا بیجا ہے کیونکہ جوابدہی کے واسطے فردیت اور شخصیت ضرور ہے اور وہی جوابدہ ٹھہر سکتا ہے جو اولاً خود مختار تھا ۔

اس کے جواب میں بہت سے لوگوں نے کہا ہے کہ اگرچہ موروثی گناہ بغیر ہماری مرضی کے تھا پھر بھی ہم اُس کی مخالفت نہیں کرتے بلکہ خوشی سے اُس کی پیروی کرتے ہیں اور اسی واسطے ہم اُس کے سبب قصوروار ہیں ۔ لیکن ہم یہ پوچھتے ہیں کہ اس کا کیا سبب ہے کہ ہم اُس کی مخالفت نہیں کرتے ؟ اِس کا سبب یہی ہے کہ یہ بات ہماری طبیعت میں داخل ہو گئی ہے ۔ گناہ غیر چیز نہیں معلوم ہوتا بلکہ ہماری طبیعت ہی میں بیٹھ گیا ہے ۔ لیکن اگر ہم اسی سبب سے قصوروار ہیں کہ ہمارے افعال ہماری طبیعت کے مطابق ہوتے ہیں تو شیر بھی قصوروار ٹھہریگا اسواسطے کہ وہ اپنی طبیعت کے مطابق خونریزی کرتا

Scanned by CamScanner

ہے ہاں البتہ اور آدمیوں سے اور خاص کر والدین وغیرہ سے گناہ کی طرف بہت میلان حاصل ہوتا ہے لیکن اگر گناہ کا تمام میلان اُن ہی سے حاصل ہوتا یعنی اگر آدمی شخص واحد نہ ہوتا بلکہ صرف کل آدمیت کا ایک حصّہ ہوتا (یعنی انسان کی جزئی نہ ہوتا بلکہ جزو ہوتا) تو پھر ہر ایک کی جُدا جُدا عدالت کس طرح ہو سکتی؟ جو کچھ صرف اسی سبب سے ہر ایک شخص میں ہے کہ وہ بنی آدم میں شامل ہے اُسکے سبب قصوروار ی ممکن نہیں یعنی وہ فی الحقیقت گناہ نہیں ہو سکتا اسکے جواب میں وہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ محبت اور ہمدردی کا کام ہے کہ ہم اپنے تئیں سارے بنی آدم سے الگ نہیں بلکہ اُنکے گناہ میں شریک سمجھیں لیکن کیا خدا کو بھی جو محبت سے پُر ہے چاہیئے کہ اپنے تئیں آدمیوں کے گناہ میں شریک سمجھے؟ پس صرف اس واسطے ہم لوگوں کو ایسا سمجھنا مناسب ہے کہ ہم فی الحقیقت ویسے ہی ہیں یعنی گنہگار ورنہ مناسب نہ ہوتا +

اس رائے کی دوسری دلیل مقدس کتاب یعنی رومیوں کے خط ۵: ۱۲-۱۹ سے نکالی جاتی ہے - اس مقام سے یہ نتیجہ تو بیشک نکلتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح وہ گناہ جو آدم کے سبب دُنیا میں داخل ہوا آدم ہی سے سیج کے سوا تمام بنی آدم میں پھیل گیا ہے لیکن رسول یہ نہیں کہتا کہ آدمیوں کا گناہ صرف آدم کے گناہ کا نتیجہ ہے - بعضے لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب اس مقام میں آدم اوّل اور آدم ثانی کا اور اُن سے جو تاثیریں آدمیوں پر ہوئیں یا ہوتی ہیں اُن کا آپس میں مقابلہ ہوا تو ضرور ہے کہ جس طرح راستبازی اور زندگی کی تاثیر صرف سیج ہی سے ہوتی ہے اُسی طرح گناہ اور موت کی تاثیر صرف آدم اوّل ہی سے ہوتی ہے - لیکن یہ نتیجہ صحیح طور پر اِس مقام سے نہیں نکلتا چنانچہ آدم اور سیج کی تاثیروں میں اور بہت سے فرق ہیں مثلاً یہ کہ آدم کی تاثیر تو خواہ مخواہ ہر ایک آدمی کو پہنچتی ہے لیکن سیج کی تاثیر صرف قبول کرنے ہی سے حاصل ہوتی ہے +

۲- آگسٹینی لوگوں کے برخلاف آرمینی کے پیرو کہتے ہیں کہ جس وقت آدمی نیک و بد کی پہچان حاصل کر کے اپنی خود مختاری سے بدی کو پسند کرتا ہے اُسی وقت سے وہ گنہگار ہوتا ہے اور اُسی وقت سے وہ روحانی

طبعی خرابی جو اُس میں موجود ہے زور پکڑتی ہے۔ پس آدمی اِس خرابی کے سبب جو صرف میلان ہے قصوروار نہیں ہے بلکہ صرف اِس سبب سے قصوروار ہے کہ وہ اِس میلان کا پیرو ہوتا ہے اور نیز اُس کی پیروی کرنے سے جو کچھ نتیجہ پیدا ہوتا ہے اُس کے سبب سے بھی قصوروار ہے۔ لیکن یہ رائے کہ آدمی خود اِس میلان کے سبب قصوروار نہیں ہے خاص کر افسیوں کے خط کے ۲ : ۳ کے برخلاف ہے جہاں لکھا ہے کہ "ہم اپنی طبیعت سے یا پیدائش سے غضب کے فرزند تھے" یعنی قصوروار تھے۔ اِس کے سوا ہم بارھویں باب میں کہہ چکے ہیں کہ اگر ہم اِس زندگی میں بیگناہی کی حالت سے یکبارگی گناہ کرنا شروع کرتے تو یہ ضرور ہم کو یاد رہتا۔ اِس کے علاوہ یہ غور کرنا چاہیے کہ آیا اِس رائے کے جو مقصود ہیں وہ اُس سے پورے ہوتے ہیں یا نہیں +

۱۔ اِس رائے کا ایک مقصود اِس بات کا ثابت کرنا ہے کہ وہ خراب میلان جو ہم میں پیدا ہوتا ہے گناہ نہیں بلکہ دوسری چیز ہے۔ لیکن یہ ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ اس سے پہلے کہ لڑکے کے دل میں تمیز پیدا ہوتی ہے اِس لڑکے سے بہت سے بُرے کام ہوتے ہیں جو اُس میلان کے نتیجے ہیں گو کہ تمیز نہ ہونے کے سبب ہم اکثر اُنہیں گناہ نہیں کہتے۔ پس جب تمیز پیدا ہوتی ہے تو کیوں یہ سب بُرے کام غائب نہیں ہو جاتے بلکہ جوں کے توں اور زیادہ شدت سے بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ اگر ہم ابتدائے پیدائش سے بیگناہ ہیں تو کس واسطے ہم سبھی اُس خرابی کے پابند ہوتے ہیں یہاں تک کہ جب پہلے پہل تمیز کے ساتھ کام کرنا شروع کرتے ہیں اُس وقت بھی کم و بیش اُس کی قید میں پھنسے ہوئے ہوتے ہیں +

پھر جب بالغ ہو جاتے ہیں تو بھی جلدبازی اور کمزوری کے سبب بہت سے گناہ ہوتے ہیں البتہ یہ کسی قدر تو اِس وجہ سے ہوتے ہیں کہ ہم

Scanned by CamScanner

پیشیر اپنی تمیز کی نہ تھی لیکن کسی قدر اس بُرے میلان سے بھی ہوتے ہیں جو ابتدائے پیدائش سے ہم میں ہے پس اگر اس بُرے میلان میں گناہ نہیں ہے تو ہم کیونکر جانیں کہ ایسے گناہوں کے واسطے ہم کس قدر قصور وار ہیں اور کس قدر بے قصور ہیں۔ ہمارا دل تو ہمیں اُن کے سبب بالکل قصور وار ٹھیراتا ہے اور اگر ہم اپنے دلوں کی گواہی کو رد کریں تو بھی کسی طرح کا قانون نہیں ہے جس سے ہم یہ جان سکیں کہ کس کام کے لئے جواب دہ ہیں اور کس کے لئے نہیں۔ کس فعل کیواسطے مغفرت چاہیں اور کس کیواسطے نہ چاہیں؟

۲۔ اس رائے کا دوسرا مقصود اِس بات کا ثابت کرنا ہے کہ اگرچہ ہر ایک آدمی جس میں تمیز ہو گنہگار ہے اور اس واسطے قصور وار بھی ہے پھر بھی ہر ایک آدمی کی قصور واری اُس کی خود مختاری پر موقوف ہے۔ لیکن یہ ثابت کرنا آرمنی کے پیروؤں کو مشکل ہے کیونکہ اگر لوگ اسی سبب سے گنہگار ہیں کہ اُنہوں نے ہوشیار ہو کر گناہ کو پسند کیا تو یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ کروڑوں آدمی جو پہلے ہو گذرے ہیں اُنمیں سے ہر ایک نے جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکتا ہے گناہ کو پسند کیا۔ اگر کہیں کہ اُس بُرے میلان کے سبب نیکی کو پسند کرنا بہت ہی مشکل ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم بالکل خود مختار نہیں ہیں اور اس واسطے بالکل قصوروار بھی نہیں ہیں اور اس طرح سے وہ قصورواری جس کے ثابت رکھنے کے واسطے یہ رائے نکالی گئی ہے ترک ہو جاتی ہے ۔

بیسواں باب

شخص واحد میں گناہ کی ترقی

اب تک جو کچھ ثابت ہوا اُس سے ہم دُبدا ہی میں رہے۔ ایک دُبدا تو یہ ہے

کہ ہمارا اول تو یہ گواہی دیتا ہے کہ ہم بالکل جواب دہ ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ پوری جواب دہی کے واسطے پوری خود مختاری بھی ضرور ہے لیکن پھر اُس پوری خود مختاری کا کوئی خاص وقت ہم کو معلوم نہیں ہوتا کیونکہ جب سے ہم اپنے حال سے واقف ہوئے اُس وقت سے ہماری خود مختاری کسی قدر ہمارے مزاج کے ساتھ مقید معلوم ہوتی ہے اور دوسرا اُجالا یہ ہے کہ ہم کو اس بات کا تو پختہ ثبوت حاصل ہوا کہ ہم ابتدائے پیدائش سے بلکہ پیٹ میں پڑنے ہی سے لیکر گنہگار ہیں اور یہ گنہگاری نہ صرف بُرا میلان ہے بلکہ فی الحقیقت گنہگاری ہے یعنے اُس کے سبب ہم قصور وار ہیں لیکن پھر یہ ہماری دریافت سے باہر ہے کہ کس طرح ہمارا حال ایسا ہو گیا کیونکہ وہ جبلّی طبیعت جو والدین سے ہم کو حاصل ہوتی ہے اس طبعی گنہگاری سے جُدا ہے۔ پس دونو طرح سے ہمارے نکلنے کی راہ بند معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ شک نہ عقل سے دور ہوتا ہے اور نہ کتاب مقدس سے +

پس راز مذکور کو اور اس امر کو کہ آدمی کس طرح سے گنہگار ہو گیا اس امید پر چھوڑ کر کہ شاید آئندہ دنیا میں وہ ہم پر کھولا جائے اب اسی بات پر غور کرتے ہیں کہ جب شخص واحد گنہگار ہو چکتا ہے تو گناہ اُسمیں کیسا ترقی پذیر ہوتا ہے۔ اگرچہ آدمی کی خود مختاری اس زندگی میں بالکلیہ نہیں معلوم ہوتی مگر پھر بھی وہ موجود رہتی ہے۔ اگرچہ ہم اپنے تئیں گناہ سے آزاد نہیں کر سکتے بلکہ صرف مسیح ہی ہمیں اس سے آزاد کر سکتا ہے پھر بھی ہمارے اختیار میں ہے کہ چاہیں تو اپنے گناہ کے زور کو گھٹائیں اور چاہیں اُس کو بہت بڑھائیں +

خدا نے آدمی کا ایسا حال بنایا ہے کہ ایک گناہ کرنے سے دوسرا گناہ زیادہ آسانی کے ساتھ ہوتا ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ ہم گناہ کر کے اتنے خود مختار

رہیں جتنے گناہ کرنے سے پیشتر تھے بلکہ ہماری خود مختاری کا فعل ہماری خود مختاری کو گھٹا دیتا ہے۔ ہر ایک گناہ میں گویا ایک بڑا گڑھا ہوتا ہے جس کو گنہگار اور گناہ کرنے سے بھر دینا چاہتا ہے لیکن یہ غیر ممکن ہے کیونکہ وہ بے پایان ہے۔ اس لئے جب کسی کے دل میں کسی خاص گناہ کے سبب توبہ پیدا ہوتی ہے تو وہ نہ صرف اُس گناہ کے بلکہ اپنے اَور تمام حال کے سبب بھی اپنے تئیں قصوروار جانتا ہے۔ نِکلاَ نامی چودھویں صدی کے ایک یونانی مصنف نے لکھا ہے کہ "گناہ پیدا ہوتا بھی ہے اور پیدا کرتا بھی ہے اور اس سبب سے گناہ لاانتہا ہے کیونکہ عادت فعلوں کو پیدا کرتی ہے اور پھر فعلوں کے ہونے سے عادت زیادہ زورآور ہوتی ہے۔" بیشک کسی ایک گناہ کے کرنے سے ویسے ہی اَور گناہ کا خیال آپ سے آپ دل میں پیدا ہوتا ہے اور اُس کی خواہش بھی زور پکڑتی ہے یہاں تک کہ کیا گناہ دوبارہ نہ کرنا ناممکن تو نہیں ہے لیکن بہت مشکل ہے اور اسی طرح جوں جوں گناہ ہوتے جائینگے اُن سے رہائی دشوار ہوتی جائیگی +

آدمی اس ترقی کے قاعدہ کا جیسا نیکی کرنے میں پابند ہے ویسا ہی گناہ کرنے میں بھی ہے جیسا کوئی نوزادہ آدمی دفعتاً کامل نہیں ہو سکتا ویسے ہی کوئی گنہگار بھی یک لخت گناہ میں کمال نہیں پیدا کر سکتا۔ ہاں کبھی کبھی ایسا ہوا ہے کہ کسی نے مایوس ہو کر دیدہ و دانستہ اپنے تئیں کسی سخت خرابی میں ڈال دیا لیکن وہ بھی اُسی وقت گناہ میں پختہ نہیں ہو سکا اگرچہ ایسا ہونا چاہتا تھا +

پھر دنیا کا بھی حال ایسا ہے کہ اکثر ایک گناہ کے سبب آدمی اَور گناہوں میں پھنس جاتا ہے۔ مثلاً ایک جھوٹھ کو اَور بہت جھوٹھ بولنے سے چھپانا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم نے ابتدا میں تو صرف غفلت سے کوئی کام کیا مگر بعد اُس کے سبب ہمارا ایسا حال ہو گیا

کہ اپنے تئیں بڑے خطرہ اور نقصان سے بچانے کے لئے بہت بھاری گناہ کرنا پڑا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ آدمی اس ترقی کے ہر ایک درجہ سے اُلٹا پھر آئے لیکن یہ صرف اسی طرح سے ہو سکتا ہے کہ آدمی اپنا سب کچھ بلکہ اپنی زندگی کو بھی کھو دے تاکہ اُسے خدا کے ہاتھ سے پھر پائے +

گناہ کی ترقی کے خاص تین درجے معلوم ہوتے ہیں یعنے غفلت اور مخالفت کا علم یا غلامی کی واقفیت اور سخت دلی غفلت سے اکثر اپنی غلامی کی واقفیت پیدا ہوتی ہے یعنے آدمی یہ جان لیتا ہے کہ میں گناہ کا غلام ہوں اور میرے دل کی خواہشوں میں مخالفت ہے مگر اگر یہ واقفیت نجات کا وسیلہ نہیں ہوتی یعنے اگر آدمی اپنے تئیں غلام جان کر نجات دہندہ کو قبول نہیں کرتا تو اس کا نتیجہ سخت دلی ہوتی ہے +

مقدس کتاب میں لکھا ہے کہ یہ سخت دلی خدا کی طرف سے ہوتی ہے یعنے جب کوئی شخص گنہگار ہو چکتا ہے تو وہ آخر کار خدا کی طرف سے سخت دل ہو جاتا ہے۔ اس کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ جیسا اوپر ذکر ہوا خدا نے آدمیت میں ایسا قاعدہ ٹھیرایا ہے کہ اگر گناہ کی مخالفت نہیں ہوتی تو اس کی ترقی خواہ مخواہ ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ دل شریعت کے سوا خدا اپنا کلام الہام سے بنی آدم کے پاس بھیج دیتا ہے اور آدمی کے دل کا یہ حال ہے کہ اگر خدا کے کلام کو قبول نہیں کرتا تو خواہ مخواہ زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔ اس سبب سے جہاں جہاں یہ ذکر بائبل میں ہے کہ خدا نے کسی کو سخت کر دیا وہاں خواہ توریت ہو خواہ انجیل خدا کے خاص الہامی کلام کا بھی ذکر ہے۔ ممکن نہیں کہ کوئی خدا کا کلام رد کر کے اُسی حالت میں رہے جس میں وہ پہلے تھا کیونکہ غفلت سے خواہ مخواہ عداوت اور مخالفت پیدا ہوتی ہے۔ جب خدا کے کلام کی ایک کرن کسی پر پڑتی ہے

تو پھر اگر وہ وہاں سے ہٹ کر تاریکی میں آرام سے رہنا چاہے تو یہ کبھی ممکن نہ ہوگا بلکہ وہ ضرور یہ چاہیگا کہ اُس روشنی کو ہٹائے اور نیست کرے۔ اسواسطے لکھا ہے کہ پہلے فرعون نے اپنا دل سخت کیا بعد اُس کے خدا نے اُسکو سخت کر دیا۔ اور پطرس[1] نے کہا ہے کہ جو مسیح پر ایمان نہ لانے سے اُس پتھر پر ٹھوکر کھا کر گرتے ہیں وہ اُسکے لئے مقرر بھی ہوئے تھے۔

اوگسٹین سے لیکر بہت سے معلموں کی یہ رائے ہوئی ہے کہ خدا ایک گناہ کی سزا دوسرے گناہ سے دیتا ہے۔ یہ کہنا تو گناہ کے خاصہ سے انکار کرنا ہے کہ وہ آدمی کی خود مختاری سے ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ گناہ کی ترقی اور غلامی میں بڑا دکھ اور بڑی پریشانی ہوتی ہے اسواسطے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ دکھ اور پریشانی نہ صرف اُن ہی گناہوں کی سزا ہے جن کے سبب یہ پیدا ہوتی ہے بلکہ اُن گناہوں کی بھی جن سے وہ گناہ پیدا ہوئے یعنی گناہ تو گناہ کی سزا نہیں ہے مگر ایک گناہ کا دکھ دوسرا گناہ کرنے کی سزا ہو سکتی ہے +

لیکن ان سب باتوں کے علاوہ مسیح نے ایک گناہ کو ناقابل عفو کہا ہے اور یوحنا نے اُسکو مہلک گناہ کہا ہے مسیح نے تو اِس گناہ کا یہ بیان کیا ہے کہ وہ روح القدس کی نسبت کفر کہنا ہے لیکن اِسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر کوئی صرف منہ سے کفر کے الفاظ نکالے تو یہ ناقابل عفو گناہ ہوگا۔ بلکہ یہ گناہ صرف اُسی حال میں ہو سکتا ہے جب آدمی نے گناہ میں خوب ترقی کی ہو بلکہ اُس ترقی کو حد تک پہنچا دیا ہو مگر یہ کس کا حال ہو سکتا ہے؟ اُسی کا جس نے خدا کی ساری شریعت اور نجات کی خبر اور جو کچھ خدا نے بنی آدم پر روشن کیا اُسکو بخوبی اور کمال صفائی کے ساتھ جان کر دیدہ و دانستہ رد کیا ہو۔ روح القدس کی نسبت کفر نہ صرف سب سے بڑا گناہ ہے بلکہ سب سے زیادہ روحانی گناہ ہے۔ جو غفلت کی نیند میں پڑا ہے اُس سے یہ گناہ نہیں ہو سکتا۔ اِس گناہ کا خاصہ کچھ جسمانی خواہشوں کی طرف میلان نہیں ہے بلکہ خدا اور جو باتیں اُس سے متعلق ہیں اُنکی عداوت ہے اور اِس عداوت ہی کے سبب کفر منہ سے نکلتا ہے اِسکا سبب محض خود غرضی ہے جس سے آدمی بالکل خود مختار یعنے خدا سے آزاد ہونا چاہتا ہے اور جب خدا ایسی خود مختاری

[1] پطرس کے پہلے خط کے ۲ باب ۸ آیت کو دیکھو +

سے منع کرتا ہے تو اسی سبب سے آدمی اُس سے کینہ رکھتا ہے اور اگر خدا کو اُٹھا دینا اُسکے امکان میں ہوتا تو اُٹھا دیتا مگر چونکہ یہ ناممکن ہے اِسلئے اُسکو بُرا کہکر ایک طرح کی تسلی حاصل کرتا ہے۔ پولوس نے دجّال کا بھی یہی گناہ بیان کیا ہے کہ وہ اُن سب باتوں کی مخالفت کریگا جو خدا سے متعلق ہیں اور خدا کی جگہ وہ آپ خدا بن بیٹھیگا اور اِسی سبب سے وہ ابن ہلاکت کہلاتا ہے یقیناً اُسکا گناہ ناقابلِ عفو ہے۔ اِس حال میں اور عام سخت دلی میں یہ فرق ہے کہ عام سخت دلی تو عموماً خدا کے کسی الہامی کلام کے سُننے سے ہو سکتی ہے مگر اُسکا خاصکر انجیل ہی میں ذکر ہے کیونکہ یہ فقط اُنہی کا حال ہو سکتا ہے جو خدا کے سب سے بڑے مکاشفہ کے قائل ہو چکے ہیں۔ یہ ضرور نہیں ہے کہ وہ نو زادہ ہوئے ہوں اور نجات کا مزہ چکھ چکے ہوں جیسا کہ عبرانیوں کے خط کے ۶: ۴ - ۶ اور ۱۰: ۲۶ - ۳۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحیوں کا بھی یہ حال ہو سکتا ہے بلکہ صرف یہی کافی ہے کہ وہ اپنی عقل سے انجیل کے بخوبی قائل ہو چکے ہوں اور اُنکے دلوں میں بھی اُسکی تاثیر ہو چکی ہو چنانچہ جن فریسیوں سے مسیح نے کہا کہ یہ گناہ ناقابلِ عفو ہے وہ نہ تو مسیحی تھے اور نہ یقیناً ہونے والے تھے +

صاف ظاہر ہے کہ یہ گناہ اِسی واسطے ناقابلِ عفو ہے کہ اس سے توبہ کا امکان جاتا رہتا ہے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ اگر اِس گناہ سے توبہ کیجاتی تو بھی اُسکی مغفرت نہ ہوتی +

لیکن اگر کوئی گناہ قابلِ عفو ہے تو گناہ غیر فانی ہے اور اُس سے جو خلقت میں فساد ہے وہ کبھی نہیں مٹیگا بلکہ ابدالآباد تک رہیگا۔ یہ عقیدہ بہت سے لوگوں کو بڑا سخت معلوم ہوتا ہے اور اگرچہ ہم بھی مانتے ہیں کہ حیرانی کا باعث ہے۔ لیکن پھر بھی اُسے سچ ماننا ضرور ہے۔ یہ تو ہم بھی ٹھیک نہیں کہہ سکتے کہ خدا کا مقصد کیا ہے؟ اور کس طرح ساری مخلوقات کے کمال بغیر خدا کی مرضی پوری ہو سکیگی؟ لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ خدا کا مقصد ضرور پورا ہوگا اور خدا اپنی غیر متناہی حکمت سے اس مقصد کو پہنچ سکتا ہے سزا کا خاصہ یہ ہے کہ بدی مغلوب ہو جائے اگرچہ نیست نہ ہو چکی ہو اور

بدکار اپنی بدی کا پھل حاصل کرتا ہے اور اپنی بدی دوسروں کو پہنچانے نہ پائے۔ خدا کی خلقت کامل تو ہو جائیگی لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ اِس کاملیت میں کون کون شریک ہوگا کیونکہ یہ آدمی کی خود مختاری پر موقوف ہے۔ اس پر لوگ یہ کہتے ہیں۔ کہ یہ خدا کی محبت کے برخلاف ہے کہ کوئی شخص ابدالآباد تک عذاب میں پڑا رہے۔ لیکن محبت کے لئے کیا چیز لازم ہے؟ محبت کے واسطے طرفین کی آزادی ضرور ہے کیونکہ محبت میں زور نہیں ہے اور نہ وہ جبراً اپنا کام کر سکتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ بہت سے لوگ اس زندگی میں خدا کی محبت کو رد کرتے ہیں بس آئندہ دنیا میں بلکہ ہمیشہ کے لئے ایسا کرنا اُن کے واسطے کیونکر غیر ممکن ہوگا۔ اگر خدا کسی کو ابدی عذاب سے خواہ مخواہ بچانیوالا ہے تو کیوں اس زندگی میں بھی گنہگار کو جبراً نیک نہیں کرتا۔ اس طرح سے ہم ابدی عذاب کا امکان تو عقل سے ثابت کر سکتے ہیں لیکن یہ بات صرف خدا کے کلام ہی سے جانتے ہیں کہ فی الحقیقت کسی کا ایسا حال ہوگا خدا کی بادشاہت کامل ہو جائیگی اور اِسی سبب سے گنہگاروں کا اِس بادشاہت میں رہنا نہ ضرور اور نہ ممکن ہوگا جیسا ہم کہہ چکے ہیں کہ نیکی خود مختاری سے لیکر رفتہ رفتہ حقیقی آزادی تک پہنچتی ہے جسمیں گناہ کرنا پھر غیر ممکن ہوتا ہے اُسی طرح بدی بھی اپنی خود مختاری سے رفتہ رفتہ ترقی کر کے ایسے حال تک پہنچتی ہے کہ نیکی کرنی پھر غیر ممکن ہو جاتی ہے۔ یہی[1] وہ آگ ہے جو کبھی بجھتی نہیں اور وہ کیڑا ہے جو کبھی مرتا نہیں یعنے ابد تک خدا سے کینہ رکھنا اور پھر بھی خواہ مخواہ اُس کے اختیار کا اقرار کرتے رہنا +

"اُسوقت صادق لوگ آفتاب کی طرح اپنے باپ کی بادشاہت میں چمکینگے"[2] ابھی تو اُنکی حقیقی آزادی فقط مسیح ہی میں ہے وہ اُسے اپنے میں نہیں رکھتے لیکن اُسوقت جو کچھ اب اُنکا مسیح میں ہے وہ اپنے میں بھی رکھیں گے اور گناہ کا نام و نشان تک باقی نہ رہیگا۔ آمین +

تمّت

[1] مرقس ۹ : ۴۸ کو دیکھو۔ [2] متی ۱۳ : ۴۳ کو دیکھو +

Scanned by CamScanner

فہرست کتب

مسیح کا نمونہ - مصنفہ ڈاکٹر سٹاکر صاحب - جس میں سارے مسیح کی زندگی کے ہر ایک پہلو کو لے کر یہ دکھلایا گیا ہے کہ کس طور سے انسان زندگی کے تمام تعلقات میں اپنی زندگی کو خداوند یسوع مسیح کے نمونے پر ڈھال سکتا ہے - نہایت دلچسپ کتاب ہے - قیمت ۸ ر مجلد ۱۲ ر +

مسیح کی پیروی - یہ نہایت مشہور کتاب ہے - دنیا کی جتنی زبانوں میں بائیبل کا ترجمہ ہوا ہے قریباً اتنی ہی زبانوں میں اس کا بھی ترجمہ موجود ہے - ایک عاشق اپنے معشوق حقیقی کے سامنے اپنے دل کا حال کھول کر بیان کرتا اور اس کے شیریں کلام سے حظ اٹھاتا ہے - جو شخص ایک دفعہ اس کتاب کو پڑھتا ہے اس کا ایسا گرویدہ ہو جاتا ہے کہ اُسے ہمیشہ حرز جان بنا کر رکھتا ہے - بہت سے غیر مسیحی اصحاب جن کو عشق الٰہی کا مزہ پڑ چکا ہے اس کی حیات بخش تعلیم سے فائدہ اٹھا رہے ہیں - قیمت ۸ ر مجلد ۱۲ ر +

روح القدس سے معمور زندگی - مصنفہ پادری مکنیل صاحب جس میں بڑے پُر زور دلائل اور کتاب مقدس کے حوالوں سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ہر ایک مسیحی کا حق اور فرض ہے کہ روح القدس سے معمور ہو کر روحانی صفات سے ملبس ہو - روحانی زندگی کے متعلق اس کے مطالعہ سے گہرے سبق حاصل ہوتے ہیں - قیمت ۴ ر +

مکتب مسیح میں دعا کی تعلیم - مصنفہ ڈاکٹر پادری انڈریو مرے صاحب جس میں دعا کے متعلق ہر ایک پہلو سے بحث کر کے عملی ہدایات درج کی ہیں - مہینہ کے ہر روز کے لئے ایک سبق ہے + قیمت ۹ ر سنتف کور ۸ ر مجلد ۱۲ ر +

طریق تسلیم - مصنفہ پادری انڈریو مرے صاحب جس میں اپنے
آپ کو رضائے الٰہی کے تابع کرنے اور اپنا سب کچھ اسی کے حوالے کر
کی نسبت عملی طور پر بحث کی گئی ہے - قیمت ۸ر سنف کور ۸ر مجلد ۱۲ر

یاد محبوب صبح و شام کے لئے - پادری میکیڈف صاحب کی
کتاب کا ترجمہ ہے - جس میں مہینے بھر کے لئے صبح و شام کے واسطے
خاص خاص تفکرات و مراقبات درج ہیں - اُن کے ذریعہ عاشق اپنے
محبوب حقیقی کی یاد میں مشغول ہو کر راز و نیاز اور دعا و مناجات کے
پیرائے میں اپنی دلی آرزوؤں کو ظاہر کرتا ہے - قیمت ۴ر سنف ۶ر مجلد

الہام بائیبل - از ڈاکٹر پیٹرسن سمائتھ - جس میں الہام بائیبل کی ما
اور حیثیت پر مفصل مدلل اور دلچسپ بحث کی گئی ہے - الہامی کتابوں
کے ماننے والوں کے لئے خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اس کا
مطالعہ نہایت مفید ہوگا - قیمت ۸ر

یسوع مسیح کی گرفتاری اور موت - جس میں علاوہ تاریخی
حالات کے اخلاقی نصائح بھی نکالے گئے ہیں اور خاص کر صلیب کے
ساتوں کلموں پر جو خداوند مسیح کی زبان سے نکلے مفصل بحث کی ہے علم
دوست اصحاب کیلئے نہایت مفید ہے - از ڈاکٹر شاکر صاحب - قیمت ۱۲

زندہ مسیح اور اناجیل اربعہ - اس دلچسپ کتاب میں اول
مسیحیوں کے ایمان کی اصل بنیاد پر بحث کی ہے اور پھر یہ دکھایا ہے
کہ چاروں اناجیل کے حق میں اُن کے پاس کیا کیا ثبوت موجود ہیں قیمت

تاریخ بائیبل مصنفہ ڈاکٹر بلیکی صاحب - جسمیں بائیبل کے مفصل
اور تاریخی حالات اور دیگر اقوام کی تاریخیں جن کا اُن میں ذکر آیا ہے
دی گئی ہیں - صفحہ ۵۰۰ قیمت عہ ر

تمام درخواستیں بنام اسسٹنٹ سکرٹری پنجاب ریلجس بک سوسائٹی لاہور انارکلی چاہئیں